

...اور سائے بولنے لگے





انور ربانی

... اور سائے بولنے لگے



انور ربانی

ناشر

سرمدی پبلیکیشنز

اولڈنمبر 158، نیونمبر 328 لائیڈس روڈ، چنئی-86

نام کتاب	... اور سائے بولنے لگے
نام مصنف	انور ربانی
مصنف کا پتہ	41/18، ایلیفنٹ ٹینک، سکنڈ سٹریٹ، چنئی-14
	فون: 28473497
تعداد	1000
سن اشاعت	2004ء
ناشر	سرمدی پبلیکیشنز
	اولڈنمبر 158، نیونمبر 328 لائیڈس روڈ، چنئی-86
قیمت	مجلد 175، غیر مجلد 150
زیرِ نگرانی	سجاد بخاری

ملنے کے پتے

- سرمدی پبلیکیشنز - اولڈنمبر 158، نیونمبر 328 لائیڈس روڈ، چنئی-86
- مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، علیگڑھ، ممبئی
- انور ربانی، 41/18، ایلیفنٹ ٹینک، سکنڈ سٹریٹ، چنئی - 14،
  فون: 28473497

انتساب

میری شریکِ حیات

اور

میرے لختِ جگروں کے نام

جو

اسرارالدین الیاس

فہیم الدین فاروق

سلیم جاوید

وقار فاطمہ

کے ناموں سے میرا نام جگ میں روشن کر رہے ہیں

اور

جنوبی ہند کے ان تمام قلمکاروں کے نام

جن کی ادبی کاوشوں سے

تمل ناڈو میں اردو ادب کا چمن

سدا سرسبز و شاداب ہے۔

فہرست

اپنی بات



انسان کی تلاش میں ہے انسان
(جگر)

خدا کا شکر ہے کہ مجموعہ تیار ہے اور قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

انسان ایک ایسی اکائی ہے اور انسانیت ایک ایسا مذہب ہے جس سے مفر کسی سوچ کسی مکتبۂ خیال، کسی ازم کو نہیں ہوسکتا۔ سب سے پہلے اس زندگی میں ہم انسان ہی رہتے ہیں۔ گوشت پوست، روح و دماغ، احساس، جذبہ، دل ان سب کا ملا جلا ایک قالب۔

تہذیب و اخلاق، قواعد و قوانین کبھی کبھی انسان کو ایک بہتر انسان بنانے کی بجائے اسے تنگ نظر کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور اُسے بے روح، بے جذبہ اور بے دل کردیتے ہیں۔ مگر ایک فنکار کو اسی انسان کی تلاش ہوتی ہے جو دماغ کے علاوہ دل و جذبات کا مالک ہو۔

میں اپنے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا کیونکہ کہنے کے لئے کچھ زیادہ ہے بھی نہیں۔

ان پیش کردہ افسانوں کے بارے میں یہی کہنا ہے کہ ان میں بھی اک تلاش ہے، اک انسان کی تلاش اور اسی کے ساتھ خود میری تلاش بھی مضمر ہے۔ گر قبول افتد زہے عزّ و شرف۔

ان افسانوں میں کوئی ازم یا کسی زاویۂ نگاہ کی تبلیغ کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ نہ ہی کسی بندھے ٹکے فارمولے کو لے کر افسانے لکھے گئے ہیں۔ بلکہ ذہن نے فطری انداز میں جیسے لکھوایا ویسے ہی میں نے پیش کردیا ہے۔

زبان و بیان بالکل آسان اور سادہ ہے، افسانہ کو خوبصورت بنانے اور الفاظ کی ملمع کاری سے میں نے احتراز کیا ہے۔

انسان کہانی پسند ہے۔ اسلئے داستان گوئی، ناولیں، سینما، ٹی وی، وغیرہ اتنے مقبول میڈیم رہے ہیں۔ ان افسانوں میں قاری کو ''کہانی پن'' ملے گا اور اسمیں ہر انداز اور قبیل کے افسانے ملیں گے۔ کسی میں گاؤں کا ماحول، تو کہیں شہر کی چمک دمک، کہیں بزرگ کردار کے رجحانات، تو کہیں زمانے کی تبدیلی کے رنگ، کہیں نوجوان نسل کے خیالات، تو کہیں فنطاسیہ اور کہیں مستقبلیت (Futurism) اور کہیں ہلکی جدیدیت۔

ان افسانوں کے کردار اور واقعات فرضی ہیں اور کسی شخص یا واقعہ سے انکی مماثلت محض اک اتفاق سمجھا جائے۔

مغربی تہذیب کے اثرات شہروں میں اسطرح گھس چکے ہیں کہ کیا چھوٹے اور کیا بڑے سب کی زندگیوں میں انقلاب آگیا ہے اور یہ بات سچ ہے کہ برسوں پہلے کی (Fantasy) آج کی حقیقت بن گئی ہے۔ جیسے ٹی وی، سیل فون، کمپیوٹر، کیمرہ فون یہ سب کل کے فنطاسیہ ہی تھے۔ پر آج حقیقت بن کر ہمارے سامنے آگئے ہیں۔ گویا (Fantasy) اور حقیقت میں صرف چند سالوں کا فاصلہ معلوم ہوتا ہے۔ اسلئے چند افسانوں میں فنطاسیہ کو حقیقت کے ساتھ ساتھ لیجایا گیا ہے۔

اِن افسانوں میں کردار اس بے ثبات دنیا سے نادانستہ طور پر ہلکے ہلکے گذرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ ان جھلکیوں میں کچھ روشنی ہے، کچھ اندھیرے، کہیں انسان ہیں تو کہیں انکے سائے۔ کہیں نفرت، بدگمانی اور جھوٹ بڑھ گیا ہے تو کہیں

پیش گفتار



پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

انور ربانی - اِدھر ہمارے معروف افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ملک کے معیاری جرائد میں اُن کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں۔ اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ آج سے دس سال قبل ۱۹۹۴ء میں بعنوان ''پازیب'' شائع ہوا۔ خوشی کی بات ہے کہ انہوں نے اپنا ادبی سفر جاری رکھا ہے اور اب اپنے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''اور سایے بولنے لگے'' پیش کر رہے ہیں۔ میں انور ربانی ہی کو نہیں ''اور سایے بولنے لگے'' کے ناشر سرمدی پبلی کیشنز چنئی کو بھی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

افسانہ - عصر حاضر میں اردو نثر کی مقبول ترین اور پسندیدہ صنف ہے لیکن قصہ یہ بھی ہے کہ افسانہ کے نام پر عجیب وغریب، منفی اور اوٹ پٹانگ چیزیں بھی پڑھنے میں آتی ہیں۔ یوں اس صنف کا وقار مجروح ہوتا ہے لیکن جن فنکاروں نے ادبی وتہذیبی اقدار، زبان وبیان اور رموزِ فن کا احترام کرتے ہوئے افسانہ کی حرمت کو برقرار رکھا ہے اُن میں انور ربانی بھی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ انور ربانی روایات کے اسیر ہوگئے یا گھسے پٹے اور فرسودہ موضوعات پر، وہی چلتے چلاتے انداز کو اختیار کیا۔ انہوں نے روایت کی پاسداری اور احترام سے بھی کام لیا ہے

''معصومیت اور بچپن'' کو اچھالا گیا ہے۔ ان میں بہو کی زیادتیوں پر ردِ عمل بھی دکھایا گیا ہے اور کہیں اک بیٹی کا باپ کی خطاؤں کو چھپانے کی کوشش بھی دکھائی گئی ہے۔ کہیں گاؤں کی معصوم گوری نظر آتی ہے تو کہیں شہر کا کتابی کیڑا۔ کہیں مجبور اور غریب کی خود کلامی دکھائی گئی ہے تو کہیں ''ٹیپو سلطان'' کی ظریفانہ خموشی جو اس عہد کے کمزور لوگوں کا المیہ ہے۔ کہیں ایک مجنون قسم کی فرقت زدہ عورت ہے تو کہیں آج کے زمانے کی بے فکر عورت جسے اسکا ماضی واپس بلا رہا ہے۔ اگر ان تمام کو پڑھکر آپ کو ایسا لگے کہ عمر رسیدہ لوگ ہیں جو سارے فساد کی جڑ ہیں اور انہیں کم از کم بیت المعمرین (Old Age Home) میں بھیج دینا چاہیے تو اس مسئلہ کا بھی حل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

میں سرمدی پبلیکیشن اور اس سے جڑے ہوئے اصحاب کا شکر گذار ہوں اور بالخصوص میرے دوست سید سجاد بخاری کا میں تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس مجموعہ کی اشاعت کے لئے بے حد محنت کی۔ پروفیسر سید صفی اللہ صاحب نے اپنے طور پر رہنمائی کی، انکا بھی میں شکر گذار ہوں اور پروفیسر ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کا خاص طور سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ان افسانوں پر اپنا ''پیش گفتار'' لکھا اور جناب پروفیسر ڈاکٹر عبید الرحمن صاحب کا بھی میں ممنون ہوں کہ جنہوں نے میرے تعلق سے ایک مضمون لکھا۔

آخر میں ان تمام معاونین کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس مجموعہ کو منظر عام پر لانے میں مدد کی۔

انور ربانی

اور روایت سے استفادہ بھی کیا ہے اور اسی کے ساتھ زمانے کے نئے تقاضوں اور میلانات پر بھی نظر رکھی ہے۔ گویا انہوں نے عصری تقاضوں کو اپناتے ہوئے بھی وہ جو جدیدیت اور نئے پن کے نام پر نام نہاد تجربے، کرتب بازیاں اور مضحکہ خیز حرکتیں ہو رہی ہیں اُن سے اپنے فن کو بچائے رکھا ہے۔ ''اور سایے بولنے لگے'' کے افسانے اس کے شاہد ہیں۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ انور ربانی کے ہاں افسانہ پن ہے۔ تجرید اور ابہام کی بھول بُھلیوں سے انہوں نے گزرنا نہیں چاہا۔ اُن کے موضوعات عموماً دیکھے بھالے اور عام زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے کرداروں سے قاری اجنبیت محسوس نہیں کرتا۔ اپنے افسانوں کے مجموعہ ''پازیب'' کے ''عرضِ حال'' میں انہوں نے لکھا ہے :

''حالات اپنی جزئیات میں جس طرح منکشف ہوئے ویسے ہی میں نے لکھ دیا۔'' (ص،۷)

اسی طرح زبان بھی عام فہم، صاف شفاف اور سیدھی سادی کہ قاری بارِ گراں محسوس نہیں کرتا۔ یہی پہلو اُن کے افسانوں کو پڑھنے پر مائل کرتے ہیں اور انہی وجوہ سے وہ پسند بھی کئے جاتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ انور ربانی نے زمین، زمانے، اپنے معاشرہ اور اطراف و اکناف سے اپنے فن کو دور نہیں رکھا ہے۔ یہی باعث ہے کہ اُن کے ہاں ''مٹی کی خوشبو'' محسوس ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں میں ''عکسِ جمیل'' میں زبان، ادب اور تہذیب کی بدلتی اقدار کا ماتم ہے تو ''بی ماں'' میں زمانے کی نیرنگیاں ہیں، دھوپ چھاؤں ہے، اتار چڑھاؤ ہے - کیسے کیسے، کیسے کیسے ہوگئے۔ ''پکارتے رہو'' میں عصرِ حاضر کی کھوکھلی تہذیب کی نشاندہی کی گئی ہے تو

''میری بیٹی'' میں ماڈرن تہذیب کے خوب و خراب کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ''ٹیپو سلطان'' سے بھی عصری معاشرت کے ایک پہلو پر روشنی پڑتی ہے کہ پیٹ کی خاطر انسان کو کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا ہے۔ بے زری، ناداری، افلاس اور معاشی ابتری نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ ''رپورٹر'' اور ''یہ کیا ہوگیا'' مسائلی افسانے ہیں جن میں ہمارے گھریلو مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے، عمدگی اور فنکاری کے ساتھ۔ ''لو اسٹوری'' اور ''گاؤں کی گوری'' ہلکے پھلکے رومانی افسانے ہیں، دلچسپی کا عنصر رکھتے ہیں۔ ''بلی گاؤں'' جیسا افسانہ بھی ہے۔ ظاہر ہے آج کے دور میں ایسے افسانے پڑھ لئے جائیں اور بس۔ ''اور سایے بولنے لگے'' اپنی نوعیت کا افسانہ ہے۔ نت نئی سائنسی ایجادات اور صنعتی ترقیات کے باعث آج کے انسان نے بہت کچھ پالیا ہے۔ ہم پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ ترقی کر چکے ہیں۔ آرام و آسائش کی اشیاء اور دیگر سہولتوں سے ہماری زندگی کا نقشہ بدل چکا ہے۔ خوشبو، رنگ اور روشنی ہر جگہ محسوس ہوتی ہے لیکن ان ترقیات کا ایک پہلو اور بھی ہے انسان جذبات سے عاری ہو چکا ہے، بے تعلقی اور بے حسی عام ہے، ہماری تہذیب کھوکھلی ہو چکی ہے، اقدار بے معنی ہوتی جارہی ہیں اور کیا کیا کچھ! غرض انسان انسان نہیں رہا۔ انور ربانی نے اُن پہلوؤں کی فنکارانہ انداز میں تصویر کشی کی ہے۔ یہ اقتباس :

''اب تو یہاں سب کچھ بدل گیا تھا۔ انسان، انسان نہ رہے۔ وہ پیار، محبت، امن و آشتی سب بھلا چکے تھے اور بڑی عجیب بات تو یہ تھی کہ انسانوں سے اُن کے سایے الگ ہو چکے تھے۔''

عصرِ حاضر کا تہذیبی المیہ اور کیا ہوگا۔

انور ربانی عمیق نگاہ کے ساتھ مسائل کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ تیز ہے۔ نہ صرف وہ غور وفکر سے کام لیتے ہیں بلکہ قاری کو بھی غور وفکر کے لئے مائل کرتے ہیں۔ قاری سوچتا ہے کہ ہاں ہماری زندگی یہ بھی ہے، ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ اسی عصری حیثیت نے اُن کے افسانوں کو نکھار دیا ہے، ان میں ایک طرحداری پیدا کردی ہے۔ زندگی سے قربت اور معاملاتِ زندگی پر گہری نظر کی وجہ سے اُن کے ہاں ایسے کئی جملے ملتے ہیں جن سے کڑی حقیقتوں کی آئینہ داری ہوتی ہے۔ یہ حقیقتیں جو تلخ بھی ہیں اور ترش بھی، لیکن فکر انگیز۔ میں چند درج کرتا ہوں :

'' مجبوری اور غریبی کسی سے خود کلامی کرواتی ہے تو تونگری دوسروں پر رعب جمانا اور دوسروں کی آزادی کو چھین لینا سکھاتی ہے۔'' (بی ماں)

'' زندگی میں سچ بول کر اور سچ پر اڑے رہ کر ہم نے بہت کچھ کھودیا ہے۔'' (رپورٹر)

'' ضرورت انسان کے خیالات کو بدلا دیتی ہے۔'' (رپورٹر)

'' عورت کبھی گنہگار نہیں ہوسکتی۔ وہ صرف نادان ہوسکتی ہے اور مرد ہی اُس کی نادانی کا فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔'' (یہ کیا ہوگیا)

میں شعر و ادب میں رنگ، نسل، علاقہ، مذہب اور صنف کی اصطلاحوں

میں گفتگو نہیں کرتا۔ انور ربانی کا تعلق ہر چند کہ چٹنی سے ہے لیکن مجھے اس سے بحث نہیں کہ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ اُن کی زبان پر تھوڑا بہت اپنے علاقہ کا اثر ہے۔ (یہ فطری امر ہے اور یہ اثر ہونا بھی چاہئے)۔ لیکن اُن کے افسانے خواہ موضوعات کے زاویہ سے ہوں خواہ زبان و بیان کے اعتبار سے، اردو افسانہ کی دنیا میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ اُن کا اطراف و اکناف کا مطالعہ جتنا گہرائی اور گیرائی کا حامل ہوگا اور ان کے ہاں فکری عنصر مزید راہ پائے گا، تہذیبی اقدار سے رشتہ جس قدر مزید مستحکم اور استوار ہوگا، ان کا فن اور جاذبِ نظر اور وقیع اور معتبر ہوگا اور یہ دن دور نہیں۔

سلیمان اطہر جاوید

۱۵، جنوری ۲۰۰۳ء
اروناکالونی، ٹولی چوکی
حیدرآباد- ۵۰۰۰۰۸



انور ربانی کی افسانوی فضاء

پروفیسر ڈاکٹر عبید الرحمٰن

افسانہ وہ چھوٹی سی کہانی ہے جو صنفِ جدید مغربی ادب کی دین ہے۔ اردو میں افسانہ شارٹ اسٹوری کا مترادف ہے۔ افسانہ کہانی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ لیکن افسانہ اور کہانی میں کافی فرق ہے۔ کہانی کہانی گو کی زبانی سامعین کو سنائی جاتی ہے۔ جب کہ افسانہ تحریر اور فنی نتیجہ ہے جس کو پڑھنے سے ہی مقصد کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ افسانہ مختصر ہوتا ہے۔ اسمیں زندگی کے کسی ایک واقعہ یا پہلو کو کرداروں کے ساتھ اسطرح پیش کیا جاتا ہے کہ وہ ایک ہی نشست میں مکمل ہو جائے اور پڑھنے والے پر اس کا اثر قائم کر سکے۔

انور ربانی کے افسانے کسی ازم یا کسی رو کی نمائندگی نہیں کرتے۔ نہ ہی ترقی پسند افسانوں کی ذیل میں آتے ہیں اور نہ ہی جدیدیت کے۔

مگر خاص بات یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں ''کہانی پن'' ہوتا ہے اور زیادہ تر تمل ناڈو کی مٹی کی ان میں بو باس آتی ہے۔ مگر ایک افسانہ ''اور سائے بولنے لگے'' کسی علاقائیت کا حامل نہیں ہے بلکہ ایک مستقبلیت (Futurism) پر

مبنی افسانہ ہے اور اپنی استعاریت میں انوکھا ہے۔ جو کردار پر مشتمل افسانے ہیں ان میں تمدنی تاریخ کی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً ''ٹیپو سلطان''، ''بی ماں''، ''پکارتے رہو''، ''عکسِ جمیل'' وغیرہ۔

افسانہ ''یہ کیا ہو گیا'' میں افسانہ نگار نے "An Angry Old Man" (ایک غصیلہ بزرگ) کا تصور پیش کیا ہے۔

اردو افسانوں میں فطاسیہ (Fantasy) نئی چیز تو ہے ہی۔ انور ربانی نے ''بلی گاؤں''، ''اور سائے بولنے لگے'' وغیرہ افسانوں میں فطاسیہ کو بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔

آپ کے افسانوں میں گویا رنگا رنگی (Variety) کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے جس سے عوام اور خواص دونوں محظوظ ہو سکتے ہیں۔ جبکہ عام قاری پڑھ کر ایک خاصی دلچسپی محسوس کریگا تو ایک ذہین قاری کے لئے اس کے ذہن میں کچھ کچھ ہوتا نظر آئیگا۔

میں انور ربانی صاحب کو اس افسانوی مجموعہ کو منظر عام پر لانے کے ضمن میں مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس افسانوی مجموعے کو ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

پروفیسر ڈاکٹر عبید الرحمٰن
صدر، شعبۂ اردو،
نیو کالج، چنئی -۱۴۔

عکسِ جمیل

وہ پوری طاقت سے اپنے بچوں پر گرج رہے تھے۔

''ارے نا اہلو کہاں پھینک دی میری کتاب، کیوں میری چیزوں کو تم ہاتھ لگاتے ہو''؟

''ہم نے نہیں لیا تھا ابا'' ایک کے بعد دیگرے دونوں بچے بول اُٹھے۔

''تم نے نہیں لیا تو کیا زمین کھا گئی۔ آسمان نگل گیا''

''ارے۔ رے یہ کیا آپ نے تو گھر سر پہ اُٹھا رکھا ہے'' اندر سے ان کی بیوی آ گئی۔

''چلو، چلو شبو، رضو ذرا تلاش تو کرو''۔ ان کی بیوی بچوں کو ہدایت دینے لگی۔

'' کل ہی لائی تھی میں نے ''۔ وہ بڑبڑانے لگے، ''خوش رنگ سرورق تھا اس کا، اور اس پر بڑی خوبصورت سی تصویر تھی ''۔ اور پھر بچوں کی طرف مڑ کر وہ اک دفعہ پھر دھاڑنے لگے۔

''کھال کھینچ لوں گا اگر نہ ملے تو سمجھے''

بچے سہمے سہمے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے

کیا نام تھا کتاب کا؟ بیوی نے پوچھا

''نام۔ نام۔ انگریزی کتاب وژن (Vision) کا ترجمہ تھا، ''عکس جمیل''!

''نام کچھ ہو مگر بچوں کے لئے دردِ سر ضرور ہے''

''کیا کہا میں تم لوگوں کیلئے دردِ سر ہوں؟'' اُن پر لڑائی کا موڈ طاری تھا۔

''کتابیں کیا ہوتی ہیں تمہیں کیا پتہ؟''

ہوگا بھی آپ ہی کو معلوم'' ان کی بیوی نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ اتنے میں ایک رنگین سرورق والی کتاب شبو نے کہیں سے ڈھونڈھ کر پیش کی۔ انہوں نے کتاب دیکھی اور چیخنا شروع کیا۔

ارے۔ یہ کتاب''؟ اف یہ تو ہٹلر کی بیاگرونی ''مین کانف'' ہے اور بلند آواز سے سرورق پر لکھی عبارت پڑھنے لگے۔

''میں دنیا کو اپنی تصویر پر تراشوں گا ورنہ اسے برباد کر دوں گا''۔ یہ کہکر اِدھر اُدھر نظر کی، پھر مین کانف کرسی پر پٹک کر اپنے کمرے میں وہ گھس گئے جہاں ان کی جمع کی ہوئی پوری لائبریری تھی۔ اور یہی لائبریری ان کیلئے بیش بہا خزانہ تھی۔ ان کی زندگی کا سرمایہ تھی۔

شام ہونے لگی، دریچوں سے شام کی دھیمی ہوائیں کمرے میں داخل ہونے لگیں۔ لان میں ڈولتی ہوئی پھلجھڑیاں دریچوں سے اپنی رعنائیاں اچھالنے لگیں، وہ ٹہلتے ٹہلتے رُک گئے۔ دو تین گہری سانسیں اندر باہر کیں اور اپنی کرسی پر جا بیٹھے۔ اب ان کے چہرے پر اک طرح کا اطمینان تھا۔ غصہ اب ختم چکا تھا، عادتاً وہ اپنے برسوں سے جمع کی ہوئی کتابوں کو جو ریکس میں رکھی تھیں پھر نظر کرنے لگے۔ اُنہیں کتابوں سے اک طرح کا عشق تھا۔ اور اِنہیں کتابوں کے درمیان وہ اپنے تمام غم بھول جاتے تھے۔ رنگین دلکش کتابیں۔ سرورق کی تصویریں، نئے نئے نام، یہ

سب چیزیں ان کی من پسند تھیں۔ ان کا ذہنی تناؤ دور ہونے لگا۔

کتابوں کو دیکھ کر وہ مسرور ہونے لگے۔ اور بیٹھے بیٹھے ہی پرانی یادوں کے تموج میں بہنے لگے۔

انہیں اپنے اسکول کا زمانہ یاد آنے لگا۔

شہر کا سب سے بڑا اردو اسکول، اس کا بڑا سا میدان اور پیچھے بڑا سا پانی کا نالہ یہ سب ان کی نگاہوں میں پھر گئے۔ اس وقت انہیں ناولوں کے پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ فرصت کے اوقات ہریالی بھرے میدان میں ناول لے کر بیٹھے جب وہ کھلے آسمان کی طرف دیکھتے تو ایک عجیب قسم کی کیفیت ان پر طاری ہو جاتی۔ ان دنوں وہ ناولوں کے سیٹ جمع کیا کرتے تھے۔ ان کے خیال میں ناول کا اثر اس وقت دوبالا ہو جایا کرتا ہے جبکہ پرنٹ اچھی ہو، چکنے چکنے اوراق ہوں اور رنگین چٹ پٹی تصویروں والا ٹائٹل پیج ہو۔

ایس۔ایس۔سی کا امتحان ختم ہو چکا تھا۔ ان دنوں وہ بہت زیادہ میگھور لائبریری جایا کرتے تھے۔ ان دنوں انہیں ''چوٹ'' کی دوسری جلد اپنی نجی لائبریری کیلئے درکار تھی اور دوسری جلد کئی ناولوں کے ساتھ ہال سوپروائیزر کے قریب ہی ریک میں دھنسی ہوئی تھی۔ ''چوٹ'' کی پہلی جلد کب سے ان کے گھر پڑی تھی، پر دوسری جلد کے بغیر ناول کا سیٹ پورا نہیں ہو رہا تھا۔ اور وہ کسی قیمت پر اس دوسری جلد کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہ نہیں کہ کتاب بازار میں فروخت نہیں ہوتی تھی بلکہ بات یہ تھی کہ وہ کتاب یہاں یوں ہی سی پڑی تھی۔ وہ کئی بار اپنی بنیان میں چھپا کر اسے باہر لیجانے کا قصد کر چکے تھے لیکن اس دفعہ کچھ ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ کیونکہ ہال سوپروائزر ایک کمسن لڑکی تھی اور وہ بار بار اِدھر اُدھر دیکھ لیا کرتی تھی۔

بہت سوچا تو ان کے دماغ میں ایک خیال اُبھر آیا۔

کیوں نہ اس ہال سوپروائزر سے دوستی کی جائے؟

پھر تو وہ بار بار اُسے گھورنے لگے۔ آخر اس لڑکی کی توجہ مبذول کرانے میں وہ کامیاب ہو ہی گئے۔ پہلے وہ غصہ بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی، پھر کچھ کسمسائی، اور پھر بھی ان کو اس کی طرف مسکراتے ہوئے پاکر پگھلنے لگی۔ جیسے ہر جوان لڑکی جوان نگاہوں کی حرارت سے پگھل پڑتی ہے۔ بات بنتی دیکھ کر وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ انہوں نے لڑکی سے کچھ کتابیں ڈھونڈھ نکالنے میں مدد چاہی۔ لڑکی کچھ کہے بغیر کتابوں کی ریکس کی جانب ہولی۔

لڑکی خوبصورت تھی، گوری چٹی میانہ قد، آنکھیں گول گول، چہرے گول گول، ہونٹوں پر حدت کی لالی۔

دونوں کتابیں ڈھونڈھتے، رکھتے رہے ریکس میں۔ اس اثنا میں ہاتھوں کی انگلیاں ملتی رہیں۔ آنکھوں کی پتلیاں پھیلتی رہیں اور دو تین دن میں بات ہونٹوں تک پہنچ گئی۔اب ہونٹ بھی ملنے لگے..... اس طرح چوٹ کی دوسری جلد مل ہی گئی۔

مگر ان کا یہ رومانس زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ کیونکہ لڑکی بڑی تیز رفتار تھی اور اس کے ہونٹوں پر مونچھوں کی کالی لکیر سے انہیں الرجی تھی۔

زندگی آگے بڑھتی گئی، موسم بدلے، وہ نوجوان سے جوان ہو گئے دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی۔ آزادی کا پرچم ہندوستان پر لہرانے لگا۔ مگر نہ بدلا تو ان کا یہ کتابیں اکٹھا کرنے والا شوق اور ان کا لباس جس میں شیروانی اور ترکی ٹوپی خاص طور سے نمایاں تھی۔ یہی شیروانی اور ترکی ٹوپی پہن کر مناسب کتابوں کو بغل میں

دبائے جب وہ کسی ادبی محفل یا مشاعرے میں نکل آتے تو کتنی قدر و منزلت ہوتی تھی ان کی، اِدھر ان کی نجی لائبریری بھی بھرتی گئی۔ ریکس میں پہلے پہل ناول اور سکس کی کتابیں جمع ہوتی رہیں، پھر تاریخ و سیاست کی اور پھر نفسیات اور فلسفہ کی کتابیں رونما ہونے لگیں۔ کچھ کتابیں ایسی بھی تھیں جسے انھوں نے پڑھا نہیں تھا مگر وہ ریکس کی زینت کے لئے ضروری تھیں۔

اب ان کی عمر بڑھ چکی تھی، ان کی بیوی اور دو بچے تھے اور معمولی تنخواہ میں اپنی ذمہ داریاں نبھانا انہیں مہنگا پڑ رہا تھا۔ انہیں اس بات کا بھی غم و غصہ تھا کہ زمانہ کے ساتھ کئی تبدیلیاں ہو چکی تھیں، اس معاشرہ میں، لوگوں کے رہن سہن بول چال میں، وہ معاشرہ، وہ اخلاق غائب ہو گئے تھے۔ اُس علم کے قدردان بھی نہیں تھے جس علم کا کسی زمانے میں طوطی بولا کرتا تھا، شاعری اور تصوف کے نایاب مخطوطات کو شہر کی واحد بوسیدہ اردو لائبریری سے انہوں نے اپنے گھر منتقل کئے تھے محض اس اُمید پر کہ کبھی یہ کام آئیں گے۔ کبھی دنیا اس کی طالب بنے گی مگر افسوس ایسا نہیں ہوا۔... لوگ اب ترکی ٹوپی شیروانی اور اردو زبان سے زیادہ مرعوب نہیں ہو پاتے تھے۔ اب سر سید کی ان پرچھائیوں کی ساکھ باقی نہیں رہی۔ زمانہ اب لنگی، قمیص اور کالی فرکیاپ پہننے والوں کا تھا۔ علمی، سیاسی، اور ادبی مراکز میں انہیں کی چمک دمک تھی۔ قیمتیں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ گاہے ماہے خرید کر پڑھنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ وہ اُدھار لے کر کتابیں پڑھنے لگے تھے مگر دوست بھی اب انہیں ادھار دینے سے کترانے لگے کیونکہ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ ایک دفعہ انہیں کتاب دی جائے تو شاید ہی وہ واپس ہو جائے۔

وہ ایک بار ماضی سے گزر کر پھر اپنے سامنے رکھی ہوئی کتابوں کی طرف لوٹ آئے۔ اُن کتابوں کو وہ بڑے پیار سے دیکھنے لگے۔ انہیں ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ان

کتابوں میں بند کئے ہوئے کردار ہی نت نئی شکلوں میں دنیا میں آتے رہتے ہیں۔

ان کتابی کرداروں کی کئی زندہ مثالیں اُن کے سامنے، اُن کے ملنے جلنے والوں میں تھیں۔ ان ہی کرداروں کی نسبت سے انھوں نے اپنے جان پہچان اپنے دوستوں کے نام رکھ چھوڑے تھے، چنانچہ ان کی بیوی کی بے وقت اور بے معنی رکاوٹ اور رجعت پسندی کو دیکھ کر انہوں نے کئی طرح کے ناموں سے منسوب کر دیا: میڈام ڈی فارج، یا کبھی کسی افسانہ کی ہیروین ''لیڈی ڈاکڑ''۔ بیوی تو خیر بیوی ہوتی ہے۔ مگر بچے، بچوں سے بھی وہ بہت عاجز تھے۔ کتابوں کے معاملے میں تو کبھی وہ اپنے بچوں کو معاف نہیں کر سکتے تھے۔ ''عکس جمیل'' کے اس طرح کھو جانے پر ان کا غصہ ہونا حق بجانب تھا۔ کیونکہ کتاب بڑی شاندار تھی کتنی اچھی کتنی دلکش تصویر تھی اس کے ٹائٹل پیج پر۔ اور کتنی مشکلوں سے انہوں نے اپنے بگلے سے دوست ''بگلے میاں'' سے نکلوائی تھی۔ باغ دھاوان کے مدرسہ میں رکھی پرانی دستاویزوں کے محافظ بگلے میاں کب کسی کتاب کو کسی کے حوالے کرتے۔ ہوا یہ کہ کتاب ہی اولاً انگریزی کا ترجمہ اور ماڈرن فلسفہ سے متعلق اور پبلشر نے غلطی سے باغ دھاوان کو کوئی جدید لائبریری سمجھ کر مفت ایک کاپی بھیج دی تھی اور اس طرح باغ دھاوان کے لئے فالتو کتاب ہی تھی۔ اب سارا ہنگامہ تو بس اسی کتاب کے گم ہونے پر تھا۔

وہ خیالات کی دنیا سے لوٹ رہے تھے۔ غصہ پوری طرح اتر چکا تھا۔ انہیں پیاس لگی تو نوکرانی کو آواز دی۔ اسی اثنا میں ''عکس جمیل'' بھی مل گئی اور بچہ شبو اُن کے آگے ''عکس جمیل'' رکھکر بھاگ گیا۔

نوکرانی نے چائے رکھدی اور بتی جلا کر باہر نکل گئی۔ اب ان کے سامنے چائے کی پیالی تھی اور ایک طرف ''عکس جمیل''۔ ان کے ذہن میں عمر خیام

کے کچھ اشعار رینگ آئے: اشعار کی کتاب ہو!
جام بھرا ہوا ہو
اور پاس تو ہو!

انہوں نے دوبارہ سرورق پر بنی ہوئی دلکش تصویر دیکھی۔ تصویر مہین کپڑوں میں ملبوس ایک نازک لڑکی کی تھی جس کے خط و خال بہار کی پہلی کرن کی طرح تازہ نظر آرہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں معصوم مستی تھی اور وہ ہلکی پُر کیف انگڑائی لے رہی تھی۔ رنگوں سے بھری اس تصویر کو وہ بار بار دیکھنے لگے۔ اس پر ہاتھ رکھ کر سہلایا۔ ان کے جسم سے لے کر ان کی روح تک ایک عجیب قسم کی جھرجھری محسوس ہوئی۔ اُنہیں لگا کہ ان پر ایک کیفیت طاری ہونے لگی ہے اور تصویر کے رنگ دھوئیں کی لکیروں میں تحلیل ہونے لگے اور فضا میں تیرتے چلے گئے۔ لکیریں دور ہوتی گئیں اور دھوئیں کی نئی تصویریں بننے لگیں۔ انہیں اُن میں بہت سی تصویریں جانی پہچانی لگیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے لکیریں تصویروں سے شعلہ بن گئیں، ایک رنگین شعلہ!

''اور ان کا جی چاہا کہ اس رنگین شعلے کو لپک کر پکڑ لیں مگر شعلہ ان کی گرفت سے پھسل کر بہت اونچا ہونے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے شعلہ پھر لکیروں میں تبدیل ہو گیا،....... دھوئیں کی لکیریں! اور لکیریں پھر سے سرورق پر جمنے لگیں اور لڑکی کی حسین تصویر پھر ابھر آئی،..... ایک منور تصویر، ایک دیوی کی تصویر، شاید علم کی دیوی سرسوتی کی تصویر اور دوسرے ہی لمحہ روشنی کی وجہ ان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں، بند ہو گئیں، اور اک اندھیرا چھا گیا اور ان کی نگاہوں کے سامنے کوئی تصویر باقی نہیں تھی،...... کچھ بھی نہیں تھا۔ ہاں کچھ بھی نہیں،

خدا کی قسم خدا کی طرح

ٹیپو سلطان

شہر مدراس سے کچھ دور ساحل پر کئی ایک خوبصورت مقامات کھیل کود اور پکنک منانے کے لئے بنوائے گئے ہیں۔ یہاں روزانہ لوگ انہیں دیکھنے اور موج مستی کرنے کے لئے چلے آتے ہیں۔ انہیں میں ایک گیمس پارک ہے جس کا نام "سنہرا سپنا" ہے۔ یہ مدراس سے کوئلم شریف جانے والی سڑک پر واقع ہے۔

"سنہرا سپنا" سب سے منفرد اور بڑی دلچسپ جگہ ہے۔ یہاں نئے گیمس اور نت نئے کھانوں کے ایٹم کے ساتھ ساتھ پرانے کھیل بھی نئے انداز میں پیش کئے جاتے ہیں یہاں روایتی، بریانی پلاؤ کا بھی مزہ لیا جا سکتا ہے اور نئے فاسٹ فوڈ کا بھی۔

اس پارک کے اندر جونہی آپ داخل ہونگے تین راستوں میں بٹے ہوئے ایک موڑ پر ایک منڈیر سی بنی ہوئی ہے۔ اسی پر ایک مچان سا بنا دیا گیا ہے جس پر رنگین چھڑیوں سے بنا ہوا ایک پنجرہ رکھا ہوا ہے۔ جس میں ایک آدمی رنگین شاہانہ لباس پہنے گھمبیر صورت بنائے کھڑا دکھائی دیتا ہے۔

یہ آدمی نہ ہنستا ہے نہ بولتا۔ بس چپ سادھے کھڑا رہتا ہے۔

(اسی کے پاس ایک بورڈ پر لکھی ہوئی یہ عبارت دیکھی جاسکتی ہے) "اس آدمی کو ہنسانے والے کے لئے دس ہزار روپیوں کا انعام مقرر ہے" تو اس آدمی کو طرح طرح سے لوگ ہنسانے کی کوشش کرتے دیکھے جاسکتے ہیں۔

طرح طرح کی آوازیں نکال کر طرح طرح کی صورتیں بنا کر!

کچھ لوگ اس پر گالیوں کی بوچھاڑ کرتے بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ مگر یہ ہنسنا تو دور کی بات ہے حرکت تک نہیں کرتا بلکہ ایک مجسمہ کی طرح اپنے مقام پر ٹکا رہتا ہے۔ تقریبا آدھے گھنٹہ تک وہ اسی موڑ میں کھڑا رہتا ہے پھر اسکے بعد پردہ گرادیا جاتا ہے۔ پردہ گرنے کے بعد اسے آدھے گھنٹے کے لے چھٹکارا مل جاتا ہے۔۔ اور بار بار یہی تماشہ دکھایا جاتا ہے بلکہ اس طرح وقفہ وقفہ سے اس تماشہ کو دہرایا جاتا ہے۔ اور یہ بہروپیہ آدمی ٹس سے مس نہیں ہوتا کیا آپ جانتے ہیں یہ بہروپیہ، یہ بھانڈ، نہ ہنسنے والا، مجسمہ کی طرح کھڑے رہنے والا بادشاہ کون ہے۔

ارے بھئی یہ تو میں ہی ہوں ------- جو برسوں پرانے مجسمہ کی طرح ساکت اور خاموش کھڑا رہتا ہوں اور جو ان گالیوں کی بوچھاڑ کرنے والوں اور ہنسانے والوں کو کبھی کامیاب ہونے نہیں دیتا۔

لیکن چند دنوں سے یہ سب کچھ بدل رہا ہے۔ لوگوں کے مذاق میں بدلاؤں گیمس پارک والوں کی آمدنی میں کمی جیسی باتوں کا اثر ہمارے کھیل کو دتماشوں پر بھی پڑ رہا ہے بچے آجکل الکٹران گیمس، کمپیوٹرس گیمس کے لئے پاگل ہیں۔ انہیں کھلے کھلے سادہ تماشے پسند آنے مشکل ہیں۔ بڑی بڑی کتابوں کے بوجھ سے دب کر ننھے منھے بچے بھی اپنی جبلت کو ختم کرلیتے ہیں۔

دراصل میری ڈیوٹی صبح گیارہ بجے سے شروع ہوتی ہے۔ اور ہر آدھ گھنٹہ کی

رخصت کے بعد شام کے پانچ بجے ختم ہوجاتی ہے۔ درمیان میں کھانے کے لئے آدھ گھنٹہ کا وقفہ ملتا ہے۔ اس طرح پورے ڈھائی گھنٹہ کی اس ڈیوٹی کے لئے مجھے پورے سو روپئے ملتے ہیں۔ اور کھانا بالکل مفت!

ہر یہ معاملہ اب باس کے لئے مہنگا پڑنے لگا ہے۔ کیونکہ اس ساحل سے لگے نئے نئے پارک آگئے ہیں۔۔ جہاں تفریح کے نت نئے سامان مہیا ہونے لگے ہیں۔ اور مجھے ڈر ہے کہ اگر یہ کام چھوٹ جاتا ہے تو پیسوں کی کمی کے علاوہ ان لمحوں سے بھی مجھے ہاتھ دھونا پڑے گا جن لمحوں میں گویا میں مرجع خلائق سا محسوس کرتا ہوں چاہے منفی اندازہی میں کیوں نہ ہو۔ یہ لمحے تو میرے لئے نہ صرف بہت قیمتی ہیں بلکہ یہ میری زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔

جانتے ہیں آپ کہ میں جب کسی مشہور ہستی کے بہروپ میں کھڑا کردیا جاتا ہوں تو مجھے کیسے محسوس ہوتا ہے؟ اور میں کن کن جذبات سے دوچار ہوتا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوجاتی ہے جیسے میں کوئی بھگوان یا خدا ہوں جو اپنے بندوں کی چیخ و پکار سے ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ یا یہ کہ میں زمین چاند تاروں پر محیط "قدرت" کا جیتا جاگتا مجسمہ ہوں۔ قدرت جو اپنے حساب سے چلتی ہے۔ کسی کے گڑگڑانے، چیخنے چلانے ہنسنے رونے سے اسے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔

یہ بہروپئے والا کام میرے لئے آسان بھی ہے اور دلچسپ بھی اور اس کام کو تو میں برسوں سے کرتا آرہا ہوں۔

برسوں پہلے محرم کے ایام میں ان محلوں میں بڑی دھوم دھام بڑی ہلچل ہوا کرتی تھی جہاں مسلمان بستے تھے۔ محرم کا مہینہ غریب اور بستہ عوام کے لئے ملی جلی کیفیتوں کا حامل ہوتا تھا۔ یعنے یہ کہ غم اور سوگ بھی منایا جاتا تھا اور اک طرح سے

دلچسپی اور رنگینی کے سامان بھی غیر دانستہ مہیا رہتے ہیں۔ محرم کی ساتویں آٹھویں اور نویں راتیں تو گویا خاصہ کی چیز ہوتی تھیں۔ ان راتوں میں کہیں انیس و دبیر کے مرثیے پڑھے جاتے تھے۔ لڑکے علم اٹھائے دہکتے الاؤ میں کودتے دکھائی دیتے تھے تو کہیں لوگ سڑکوں پر "تماشے" دیکھنے کے لئے کھڑے نظر آتے تھے۔

یوں کچھ لوگوں کے لئے "بارہ امام" "انکور کا منڈوا" "محرم کا اونٹ" "ڈیرہ پنجہ" جیسی چیزوں کا دیکھنا گویا نیکی کرنے کے مترادف مانا جاتا تھا۔ اکثر سر پیٹھ پر سے اوڑھی عورتیں ان جگہوں پر فاتحہ خوانی کرتی نظر آتی تھیں۔ ان دنوں جب کہ میری عمر پندرہ سولہ کی ہی ہوگی۔ مجھے ٹیپو سلطان کے لباس میں ہاتھ میں کارڈ بورڈ کی تلوار دے کر ایک خاص پلیٹ فارم پر کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ اسے مدراس میں شوبالا کھڑا کرنا کہا جاتا تھا۔ اس تلوار پر سفید چمکیلا کاغذ کچھ اس طرح لپیٹ دیا جاتا تھا کہ یہ بالکل اصلی تلوار نظر آنے لگتی تھی۔ اور پلیٹ فارم کے چاروں طرف رنگین کاغذوں سے سجاوٹ کر کے سامنے ایک سفید سا پردہ گرا دیا جاتا تھا۔ اور جب پردہ اٹھتا تو وہاں ٹیپو سلطان کھڑے نظر آتے تھے۔ جو نہ ہنستے تھے نہ بولتے تھے بلکہ بڑی سنجیدگی سے ہاتھ میں تلوار لئے کھڑے نظر آتے تھے اور اسی ٹیپو سلطان کو لوگ ہنسانے ہلانے کی کوشش کیا کرتے تاکہ ان کو انعام حاصل ہو۔ اور بھئی اس اس زمانہ میں میرا یہ بہروپ اتنا کامیاب ہوا کہ لوگ میرا اصلی نام بھول گئے اور مجھے ٹیپو سلطان ہی کے نام سے یاد کرنے لگے۔ ان راتوں میں عجیب عجیب قسم کے لوگوں سے میرا واسطہ پڑتا رہا۔ اس وقت لوگوں سے عجیب قسم کی گالیاں سننے کو ملتی تھیں اور عجیب قسم کی حرکتیں دیکھنے کو ملتی تھیں۔

ایک رات ایک نوجوان لڑکی نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ یہ لڑکی اپنے ساتھی لڑکے کے ساتھ شاید تماشہ دیکھنے آئی تھی۔ جبکہ اس کا ساتھی مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ

کر رہا تھا اس لڑکی نے مجھے بار بار آنکھ مارنی شروع کر دی۔

لیکن مجھے تو کچھ کرنا نہیں تھا نہ کچھ بولنا تھا بلکہ بت بنے کھڑے رہنے میں ہی میری خیریت تھی۔ مجھے اس کی اس حرکت پر بڑا غصہ آ رہا تھا۔

اس کا گول مٹول سفید سا چہرہ اس پر آنکھ مارنے والی یہ ادا۔۔ جی تو بہت چاہتا تھا کہ میں کچھ بولوں۔ کچھ کروں کیونکہ میرے اندر کا جانور جاگنے لگا تھا۔ پر میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں ڈیوٹی پر تھا۔

کچھ ایسی ہی بے بسی کے لمحات میں مجھے خدا کی بڑائی کا اندازہ ہونے لگتا ہے جو منکرین کا نشان ملامت تو ہوتا ہی رہتا ہے پر کبھی وہ اپنے ماننے والوں کے بھی عتاب کا شکار ہو جاتا ہے جبکہ انکی مرادیں فوراً بر نہیں آتی ہوں۔۔ اسکے باوجود خدا ان لوگوں کا کچھ بگاڑنے کی نہیں سوچتا بلکہ انہیں اس کی بنائی ہوئی "تقدیر" کے فیصلہ پر چھوڑ دیتا ہے۔۔۔ وہ چاہے تو آن کی آن میں ایسے لوگوں کو مٹا دے جو اس کی شان میں گستاخی کرتے ہیں۔ لیکن نہیں، وہ تو خدا ہے تمام بادشاہوں کا بادشاہ، تمام کائنات کا مالک ۔۔۔

انہیں دنوں ایک دلچسپ واقعہ ہوا تھا۔ میرے ایک دوست کو "ٹیپو سلطان" بننے کا شوق چرایا مگر وہ دو تین دنوں سے آگے چل نہ سکا کیونکہ ٹیپو کی بڑی مونچھیں اس کی ناک میں گھس کر اسے بیقرار کرنے لگتی تھیں اور بار ہا وہ چھینکوں کا شکار ہونے لگتا تھا آخر کار مجھے ہی دوبارہ "ٹیپو سلطان" بننا پڑا۔۔۔

"ٹیپو سلطان" کے اس بہروپ سے مجھے اتنا لگاؤ اور اتنی لگن ہو گئی تھی کہ میں بھول جاتا تھا کہ میرا اصلی روپ کیا ہے۔

جب کبھی مجھے "ٹیپو سلطان" بنا کر کھڑا کر دیا جاتا تو مجھے یہی یاد رہتا کہ میں ایک

عظیم بادشاہ ہوں، انگریزوں سے انتقام لینا ہی میرا اولین فرض ہے۔ اور مجھے ایسا محسوس ہو تا کہ جیسے میرے آگے انگریزوں کے سر کٹے پڑے ہیں۔

اور یہ کہ میری ہی تلوار کا یہ کرشمہ ہے اور پھر میری گردن فخر سے اونچی ہونے لگتی اور میرا سینہ جوش سے پھول جاتا اور دل و دماغ پر ایک نشہ چھا جاتا اور یہ نشہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی بھی قیمت پر اسے واپس نہیں کیا جا سکتا۔

مگر اب زمانہ بدل گیا ہے۔ وہ لوگ نہیں رہے، وہ راتیں نہیں رہیں اور نہ وہ باتیں۔ پھر بھی گیمس پارک والوں کی وجہ سے، ہم جیسے کلاکاروں کو ایک آسرا ملا تھا۔

میں "سنہرا سپنا" میں کافی خوش تھا کہ مجھے پھر سے ٹیپو سلطان بننے کا موقع مل گیا

"سنہرا سپنا" میں ایک دفعہ ایک انگریزی جوڑا میرے آگے کھڑے اپنے انداز میں مجھے ہنسانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مختصر سے لباس میں ملبوس یہ دونوں آپس میں لپٹ لپٹ کر مجھے انگریزی میں شاید گالیاں دینے لگے تھے۔ اور وہ لڑکی جس کی سینہ پر برائے نام کا بلاؤز تھا اور جو صرف انڈر ویر پہنے کھڑی تھی اپنی ادھ پکی ہندی میں مجھ سے کچھ بکواس کرنے لگی تھی۔

ٹیپو، یو فیلو! لاف میان۔۔۔ ہم تم کو پیسہ دے گا۔ یو فول دو سو۔ پانچ سو۔۔ بولو۔ بولو۔ کتنا، تم کو روپیہ نہیں منگتا۔۔۔ تم ہم کو مانگتا۔ بولو۔ لاف۔ یو بیاسٹ۔۔۔ وہ شاید گالی دیتے دیتے رہ گئی۔ اس طرح وہ پندرہ بیس منٹ سامنے کھڑے بے حیائی کا مظاہرہ کرتے رہے اور پھر جب ان کو دیکھنے کے لئے کافی لوگ جمع ہو گئے تو وہ وہاں سے کھسک گئے۔

تو لوگو اب یہ خوشی بھی مجھ سے چھن جائے گی۔ جب ایک دو دن میں "سنہرا سپنا" سے میں نکال دیا جاؤں گا۔

پتہ نہیں آئندہ میرا کیا ہو گا۔ کیا مجھے کہیں پھر سے ٹیپو سلطان بننے کا موقعہ ملے گا، شاید نہیں۔۔

شاید میں کسی پان بیڑی کی دکان میں نوکری کر لوں یا کسی پیٹرول بنک میں اپنی روزی تلاش کر لوں یا ایسی جگہ چھوٹے موٹے کام کر لوں جن سے میری روٹی کا بندوبست ہو جائے۔۔۔ ہاں مجھے دو وقت کی روٹی تو بہر طور مل جائے گی پر وہ لمحے مجھے کہاں ملیں گے جن میں اپنے آپ کو میں نے کھوج نکالا ہے۔ وہ لمحے جن میں اپنے اندر کا بادشاہ، اپنے اندر کا ٹیپو سلطان ابھر کر آتا ہے۔۔۔۔ یوں دیکھنے والوں کے لئے میں ایک بھانڈ ایک بہروپئے سے زیادہ نہیں لگتا لیکن میں ہی جانتا ہوں کہ اس وقت میں کیا سے کیا بن جاتا ہوں۔ اور کیا محسوس کرتا ہوں۔

بے شک اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسا کہ میں ہمیشہ ٹیپو سلطان تھا اب ٹیپو سلطان ہوں اور آئندہ بھی ٹیپو سلطان رہوں گا۔

میں تو کہتا ہوں کہ ہر انسان کے اندر کوئی نہ کوئی چھپا بیٹھا ہے کسی کے اندر بادشاہ ہے تو کسی کے اندر فقیر کسی کے اندر ظالم ہے تو کسی کے اندر مظلوم، کسی میں شہید چھپا ہے تو کسی کے اندر غازی، یہ تو وقت وقت کی بات ہے۔ وقت کب کسی کا ساتھ دے دے یا کب کسی کا ساتھ چھوڑ دے پتہ نہیں چلتا۔ اور وقت کو کبھی برا بھلا نہ کہنا شاید کہ یہی بھگوان ہو، خدا ہو۔

آج "سنہرا سپنا" میں میرا آخری شو ہے۔ میری چھٹی کر دی گئی ہے اور آج اس جگہ مجھے آخری بار ٹیپو سلطان بننا ہے۔

باس نے کہا ہے کہ میں شام سے پہلے اپنا شو ختم کر کے نکل جاؤں کیونکہ خبروں کے مطابق کچھ دہشت پسند گیس پارکوں میں گھس آئے ہیں اور یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے

تھوڑا سا ٹنشن ہے اور پولیس کے دستے ادھر ادھر گھومتے دکھائی دے رہے ہیں۔ پر میرے دل سے تو یہی دعا نکل رہی ہے کہ : اے خدا تو مجھے ہمیشہ ٹیپو سلطان بنائے رکھنا، جھوٹ موٹ کا ہی سہی تھوڑے سے وقفہ کا ہی سہی۔

اب میں اس پلیٹ فارم پر کھڑا ہوں، جہاں مجھے دیکھ کر تماشائی مجھ پر آوازیں کستے ہیں۔ مجھے بھانڈ، بہروپیہ، بفن اور نامرد کہہ کر اپنی اپنی زبانوں کے تیر مجھ پر چلاتے ہیں۔ پر انہیں یہ پتہ نہیں کہ میں صرف ڈیوٹی نباہ رہا ہوں، چپ رہنے کی ڈیوٹی اور اس ڈیوٹی میں کس قدر کامیاب ہوں وہ تو یہاں کا بچہ بچہ جانتا ہے۔

ارے! ۔ اب تو کچھ گولیوں، کے چلنے کی آواز بھی سنائی دینے لگی ہے۔ کہیں کچھ دہشت پسندوں نے ہنگامہ تو نہیں کھڑا کر دیا۔

اف ۔۔ گولیاں کہیں قریب سے ہی داغی جا رہی ہیں۔ لوگو بھاگ تم نکلو ۔۔ چلے چلو یہاں سے ۔۔ اف ۔ آہ ۔۔ گولی مجھے بھی لگ چکی ہے۔

آہ ۔ آہ ۔ میں بس گر رہا ہوں ۔۔ نہیں بلکہ نیچے گر چکا ہوں، خون میں لت پت ہوں، پتہ نہیں کتنے لمحے اور جیوں گا ۔۔ تھوڑی ہی دیر ۔ اور میں اس ۔ دنیا ۔ میں ۔۔ نہیں رہونگا ۔۔ مگر تم ۔۔ تم میرے متعلق اوروں کو ضرور بتا ۔ ناکہ میں میری تلوار نقلی، میری مونچھیں میرا لباس نقلی ۔۔ تھا ۔۔ مگر ۔۔ میری ۔۔ موت ۔۔ اصلی تھی۔

میں ۔۔ میں ۔۔ ڈیوٹی پر مرا ۔۔ تھا ۔۔ ٹیپو سلطان کی ۔۔ موت ۔۔ مرا تھا ۔۔ ایک شہید ۔۔ شہید کی ۔ موت ۔۔ اور ۔۔ اور ۔۔ ۔ شہید نہیں مرتے ۔۔! کبھی نہیں!! ۔

لو اسٹوری

مدراس کے سمندر کا ساحل بے شک بہت ہی خوبصورت اور دل موہ لینے والی جگہ تو ہے ہی لیکن روزی کے لئے خلیج بنگال کا یہ گڑگڑاتا ہوا پانی اور اسکے ساتھ لگا ہوا یہ ریتیلا میدان جو مرینا بیچ کے نام سے موسوم ہے ایک علامت، اک فلسفہ حیات بن چکا تھا۔

یہ شاید ۱۹۵۰ کی بات ہے۔

اس وقت سڑکوں پر اتنی بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔

ساحل پر سر شام لوگ کثیر تعداد میں جمع ہوتے تھے لیکن اس وسیع ریتیلے میدان میں جو کئی کلومیٹر تک بچھا ہوا تھا لوگوں کی یہ کثیر تعداد ما نو گم ہو کے رہ جاتی تھی۔

مدراس (چنئی) کے مشرق میں جہاں سمندر، ریت اور پکی سڑک کی تین متوازی قطاریں پڑ گئی تھیں وہیں سیر و تفریح کا قدرتی سامان مہیا ہو گیا تھا۔

پکی سڑک اور ریت کے درمیان ایک چھوٹی سی پگڈنڈی تھی جو خوبصورت اور خوشبودار بیلوں، پھولوں سے ڈھکی رہتی تھی۔ اور یہ سیدھے سینتھوم تک جاتی دکھائی دیتی تھی اور

اُوپر سڑک پر سے دیکھا جائے تو یہ پگڈنڈی گویا کسی دلہن کی پھولوں سے لدی چوٹی نظر آتی تھی۔ اور یہ وہ راستہ ہے جو اسوقت لورز پاتھ (Lovers Path) کے نام سے مشہور تھا۔

یہاں کی شامیں، شباب اور رنگینی سے بھرپور ہوتی تھیں، اور بڑی رات تک اس جگہ نوجوانوں، مرد اور عورتوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ کئی پریمی اس راستے سے گذر چکے تھے۔ انکی دبی مُسکراہٹوں اور شرمیلی کھُسر پھُسر سے یہاں کی ہوائیں تک مست سی ہو جاتی تھیں۔

جہاں سے یہ پگڈنڈی شروع ہوتی تھی، وہاں سمنٹ کی کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور اس جگہ خاص کر پاکستان سے آئے ہوئے سندھی مہاجر سر شام تفریح کے لئے آیا کرتے تھے۔ اس کی مناسبت سے اس جگہ کو سندھی بیچ کا نام دیا گیا تھا۔ چونکہ اکثر سندھی کپڑے کے بیوپاری ہوا کرتے تھے نئے فیشن اور ڈزاین کے کپڑے یہ زیب تن کئے ہوئے آیا کرتے۔ یہاں خصوصاً اتوار کی شام بڑی رنگین ہوا کرتی تھی۔ جبکہ خوبصورت سندھی لڑکیاں نت نئے لباسوں میں دیکھی جا سکتی تھیں۔

اسوقت ہم بہت چھوٹے تھے پر یہاں کی محبت بھری کہانیاں سنتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی ان کہانیوں کے ہیرو ہیروئین کا بھی اسی پگڈنڈی پہ ہمیں دیدار نصیب ہو جاتا تھا۔

کہانیاں یوں تو بنتی رہیں بگڑتی رہیں مگر ایک کہانی ایسی رہی جو ہم لگاتار سنتے رہے اور جو برابر آگے بڑھتی رہی، وہ کہانی تھی مشہور پیراک راجہ اور اسکی خوبصورت ہیروئین روزی کی۔

ان کی ملاقاتیں، ان کے کپڑے، ان کا اسٹائیل ہم سب کے لئے رومانس کی علامت بن گئے تھے۔

راجہ ایک نہایت ہی خوبصورت بلند قامت اور گٹھیلا نوجوان تھا۔ اس کے لئے سمندر تو گویا ماں کی گود جیسا تھا۔ کئی دفعہ اس نے گوروں سے سوِمنگ کے مقابلے جیتے اور کئی تمغے بھی حاصل کئے تھے۔

یہ بلند قامت خوبصورت پھرتیلا نوجوان جب سمندر کی لہروں کو تیزی سے چیرتا ہوا دُور نکل جاتا تو ایسے لگتا جیسے کوئی چیتا پانی پر تیر رہا ہے۔ اور اسی لئے کچھ لوگ اُسے ''چیتا'' کے نام سے پکارنے لگے تھے۔

اس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ سمندر میں بہت دُور نکل کر گویا غائب ہو جاتا تھا اور کئی گھنٹوں بعد ہی واپس نظر آتا تھا۔ کئی پیراکوں نے اسے شارک کے بچوں سے کھیلتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک خاص شارک سے اس کی دوستی بھی ہو گئی تھی اور وہ دونوں کئی دفعہ ایک ساتھ پاس پاس تیرتے ہوئے نظر آتے تھے۔

روزی اپنے نام کی مناسبت سے بہت ہی حسین، گلاب جیسی لڑکی تھی۔

اس کی آنکھوں کی اک اک جنبش سے ہزاروں گویا میکدے پھوٹتے تھے۔ ایسی مست تھی اس کی آنکھیں!

اپنے خوبصورت لباس میں مٹکتی پھسلتی لورز پاتھ پر جب وہ قدم رکھتی تو کوئی ایسی آنکھ نہ تھی جو اس کی طرف کھنچ نہ گئی ہو۔

چاندنی راتوں میں جب روزی اور راجہ محبت کے نشے میں گُم ہاتھوں میں ہاتھ لئے لورز پاتھ پر نکل پڑتے تو اس وقت روزی کا ممیرا بھائی دانیال ان دونوں کے پیچھے ہو جاتا اور اپنے وائلن (Violin) پر موزارٹ، بیتھووَن جیسے مغربی کلاسکس کی دھنیں چھیڑ دیتا تھا۔ اور اسوقت لور پاتھ ایک سُر اور مہک کا حسین خواب بن کے رہ جاتا۔

ایسی ہی ایک چاندنی رات تھی جب چاند کی روشن بوندیں سمندر کی سطح پر تیرتی نظر آ رہی تھیں اور سمندر کا پانی اچھل اچھل کر چاند کے مُنہ کو چومنے کی کوشش کرنے لگا، کہ ایک بڑی مچھلی اپنے بچے کے ساتھ ساحل کے قریب تیرنے لگی تھی۔ پر ایک بڑی زوردار لہر نے اُس کے بچے کو زور سے ریت پر پھینک دیا تھا...... اور ...... یہ بیچاری شارک اپنے بچے کے لئے پانی میں دیوانہ وار تڑپنے لگی تھی۔ کبھی وہ آسمان کی طرف دیکھتی تو کبھی ساحل کی طرف مُنہ کر کے سر گھمانے لگتی، گویا زبانِ حال سے کہہ رہی ہو کہ کوئی اس کی مدد کرے اور اس کا بچہ اسے لوٹا دے۔

..... تو بس لوگوں نے اس وقت دیکھا کہ کس طرح راجہ نے بڑھ کر شارک کے بچہ کو دُم سے پکڑ کر پانی میں پھینک دیا۔ مگر یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ کسی کو پتہ نہ چلا کہ راجہ نے کیا کیا؟...... اور کہا جاتا ہے کہ یہ وہی بڑی مچھلی تھی، وہی شارک تھی، جو راجہ کی دوست بنی۔

چونکہ راجہ کے بالکل قریب یہ شارک اکثر تیرتے دکھائی دیتی تھی مچھیروں نے یہ کوشش کی کہ اسے گھیر کر اپنے جال میں پھانس لے۔ مگر راجہ کے ہوتے ہوئے اس شارک کو کوئی ہاتھ لگا نہیں سکتا تھا۔

بیشک یہ سب بعید از قیاس ضرور لگتا ہے۔ مگر یہ ہے ایک پیار کی کہانی جسے آپ کا دماغ مانے نہ مانے دل ضرور ماننے لگا ہے اور ہمارا احساس ان باتوں کا خیر مقدم کر رہا ہے۔

اسکول سے ہم کالج میں داخل ہوئے تو یوں سمجھے کہ ہمارے پر نکل آئے تھے۔ پڑھائی لکھائی کے علاوہ شعر شاعری کی محفلیں، ہنگامے اور رومانس ہمارے مشاغل میں شامل ہو گئے۔ ان دنوں بڑے لوگوں سے آٹوگراف لینا، اپنے ہیرو

ہیروئین سے ہاتھ ملانا یا ان سے بات کرنا بڑا ہی پسندیدہ مشغلہ ہوا کرتا تھا۔ اور اسی لئے ہم میں سے اکثر راجہ، روزی اور دانیال سے ہلو، ہلو تک کے دوست بن گئے تھے۔ بیشک روزی، راجہ، دانیال کی علاوہ جسمیں ایک مچھلی بھی اہم رول ادا کر رہی تھی وہ کہانی سب سے زیادہ مقبول لو اسٹوری بن نہ گئی ہو یہ کیسے ممکن تھا۔

جب مرینا بیچ پر رات کی دلہن اپنا بسیرا کرنے لگتی تو سفید مرغابیاں چاندنی پی پی کر جیسے اڑنے لگتی تھیں، مچھیرے نرم ٹھنڈی ریت پر اپنے کٹران (Catamaron) کے اردگرد بیٹھے دیسی شراب پیتے اور تامل گیت چھیڑنے لگتے تھے اور بندرگاہ پر رُکے جہازوں کے قمقمے تاروں کی طرح پانی میں چمکنے لگتے، ہوائیں مہک اٹھتیں، اور اسطرح رات اِک طلسم ہوش ربا کی طرح انسانوں پر چھا جاتی۔ اور اس طلسم میں تیرتی ہوئی جو اہم شکلیں ابھرتیں وہ راجہ اور روزی کی ہوتیں۔

کالج سے فراغت پا کر نوکری کے سلسلہ میں بنگلور جانا پڑا اور کچھ دنوں کے لئے میرا رشتہ مدراس سے منقطع ہو گیا۔ اسی دوران میں نے اخباروں میں یہ خبر دیکھی کہ مدراس کے مشہور پیراک راجہ کی موت ہو گئی۔ شارک نے اسکے پیروں کو کاٹ کھایا جسکی وجہ وہ اپنی جان سے گیا۔

حسن اور عشق کی اس داستان کا خاتمہ اسطرح دردناک ہوگا ہمیں امید نہ تھی!

چند دنوں بعد جب میں مدراس لوٹا تو مجھے پھر مرینا جانے کا موقع ملا.... پھر وہی شام تھی، چاند سمندر سے اوپر اٹھ رہا تھا۔ لورز پاتھ سے نیچے ایک اور پکی سڑک بن گئی تھی جہاں موٹر گاڑیاں ٹھہرنے لگی تھیں۔

لورز پاتھ پر اب خوشبودار بیلیں نہیں تھیں۔ آس پاس سکون کی بے حد کمی محسوس ہونے

گئی تھی۔ اس جگہ مجھے بار بار روزی کا خیال آنے لگا تھا...... اور تھوڑی ہی دیر بعد مجھے وایلن (Violin) کی مغموم دھن سنائی دینے لگی۔ مجھے لگا جیسے روزی کا کزِن دانیال وایلن بجا رہا ہے اور میں بجانے والے کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا اسکے قریب ایک عورت بھی ہے جو اپنا چہرہ اپنے پیروں میں چھپائے اکڑوں بیٹھی ہوئی ہے۔ قریب جا کر میں نے اسے پکارا ''دانیال'' (Daniel)۔

''اُو ینگ میاں تم''! اس نے مجھے فوراً پہچان لیا۔

''تم کہاں تھے۔ اتنے دن۔'' اور خود ہی بولنا شروع کر دیا۔

''چیتا اس دنیا میں نہیں ہے، میاں (He is no more!)

''ہاں، دانیال۔ سو ساڈ۔ (So Sad)

پھر اسکے بازو بیٹھی ہوئی عورت نے مجھے اپنا سر اٹھا کر دیکھا '' او تم ..... تم کدھر تھا''۔

''چیتا از نو مور۔ ہی از نو مور .... بٹ ... بٹ ... وہ ضرور آئیگا۔ آئیگا نا دانیال؟ '' (Cheeta is no more.... He is no more. But he will come back)۔

یہ روزی تھی جو غمگین آواز میں بول رہی تھی۔

''ہاں روزی، وہ ضرور آئیگا۔ ہم سب اسکو ویٹ کرتا نا اسکے لئے وہ ضرور آئیگا!''

''معلوم ہے تم کو ینگ مین! میں، دانیال، شرمیلی سب اسکو ویٹ کرتا..... اسلئے وہ ضرور آئیگا....... وہ ضرور آئیگا.......''

روزی اب اک عمر رسیدہ بے ڈھب عورت لگ رہی تھی۔

'' روزی تم کیسی ہو؟ '' میں نے دریافت کیا۔

'' Not Bad '' ہم تو ادھر چیتا کو ویٹ کرنے آیا..... وہ دیکھو چاند اوپر آگیا

..... تھوڑی دیر میں وہ شرمیلی پانی پہ آئیگی....... شرمیلی..... تم دیکنا ہم سب ملکر (Pray) کریگا۔ دعا کریگا۔ '' ..... چلو چلو دانیال چلو '' اور وہ دانیال کو کھینچتے ہوئے پانی کی طرف..... بڑھ گئی.....

اور میں بھی ان کے ساتھ ہولیا۔

یہ کیا بکواس ہے دانیال ''یہ شرمیلی ... یہ انتظار...... یہ شرمیلی کون ہے؟''

''اوہ... تم ابھی ہم کو بے وقوف سمجھتا ..... راجہ کا فرینڈ مچھلی تھا نا اسکا نام ہم شرمیلی رکھا... ابھی دیکھو وہ پانی پہ شرمیلی آئیگا ...... اور پھر ہم سب ملکر دعا کریگا..... جانتے ہو جب راجہ لاسٹ ٹائم پانی میں گیا، وہ پرومیس (promise) کیا واپس آکر وہ روزی سے برابر شادی منائے گا۔ اور سمندر کے اندر سے ہیروں کا پیٹی لاکر روزی کو گیفٹ دیگا''۔ دانیال کہتا چلا گیا۔

.... ان دونوں کے ساتھ کچھ دیر پانی کے قریب مجھے بھی بیٹھنا پڑا ... دوران گفتگو مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ دانیال نے روزی سے شادی کر لی۔

.... کچھ زیادہ دیر نہ گی کہ سمندر سے ایک شارک ابھرنے لگی جسے دیکھکر آس پاس کے لوگ دور بھاگنے لگے۔ مگر دانیال کے اصرار پر مجھے وہیں بیٹھنا پڑا ... ''شرمیلی ہمارا فرینڈ ہے ینگ میان...... تم گھبراتا نی!''

'' شرمیلی ' شرمیلی!'' روزی نے آوازیں دیں اور چاندنی میں چمکتی یہ شارک پانی میں ڈبکیاں لگا لگا کر اوپر اٹھتی دکھائی دی ..... پھر کچھ دیر کے لئے مچھلی آسمان کی طرف منہ اٹھائے خاموش کھڑی رہی۔ اور روزی اور دانیال آنکھیں بند کئے دعا کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد روزی نے آنکھیں کھولدیں۔

شرمیلی - راجہ ضرور آیگا ، چیتا ضرور آیگا۔ تمہارا فرینڈ ضرور آیگا۔

پانی میں دور کھڑے جہاز اب 'بھاں - بھاں' کرنے لگے .. اور دیکھتے ہی دیکھتے سفید شارک دُور ہوتی گئی اور پانی کی سفید لکیروں میں گم ہوگئی۔

ہمارے پیچھے ایک شہر تھا ، جگمگاتی سڑکوں کا، انسانوں کی بھیڑ کا۔

ہم اب اُس شہر کی طرف لوٹ رہے تھے۔

'' ینگ میان، کیا تم کو معلوم راجہ کو کون مارا۔ ''

'' کیوں روزی، مچھلی نے تو مارا تھا اسے ''

'' نئی ۔ نئی ..... اس کو تو آدمی لوگ مارا..... مچھیرے لوگ نایف سے اسکو کٹ کیا۔ ''

کیوں روزی ؟

'' مچھیرے لوگ اس مچھی کو پکڑنا چاہتا تھا... پر راجہ نے اسکو منع کیا۔ اور.....اور ..... Perhaps راجہ اور مچھیروں کا ہیرے کی پیٹی کے واسطے بھی جھگڑا ہوا جو پیٹی اس سمندر میں تھا جس کو راجہ جانتا تھا ۔ اس کے لئے وہ لوگ راجہ کو کھتم کر دیا۔ " Man is a dangerous animal my child " ... انسان بہت خطرناک جانور ہے۔ میرے بچے ''

اس واقعہ کے دو ایک برس بعد ہی مجھے مرینا جانے کا اتفاق ہوا۔ اب کے میرے ساتھ میری دلہن تھی۔ لورز پاتھ پر گزرے ہوئے واقعات سنکر وہ حیران تھی۔ روزی اور راجہ کی کہانی تو اسکے لئے ایک من گھڑت داستان معلوم ہوتی تھی۔

لورز پاتھ اب بالکل برباد ہو چکا تھا۔

یہاں ہر جگہ اب بھیڑ اور شور شرابا تھا۔ ساحل پر لہریں شراب پیے ہوئے گھوڑوں کی

طرح لپک رہی تھیں۔ آج بھی چاندنی بدستور اپنے رنگ دکھانے کی کوشش کر رہی تھی ..... اور لورز پاتھ کے کسی کونے سے پھر وائلن کی کوئی مغموم دُھن سنائی دی... بیشک وہ دانیال ہی تھا۔

'' دانیال یہ تمہاری کیا حالت ہوگئی ہے؟ اور...اور... روزی کہاں ہے ؟'' میں نے اسکی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

مجھے دیکھ کر وہ رو پڑا .... سسکیاں بھرنے لگا......

''روزی اس دنیا میں نئی ہے۔ ہم.. اکیلا ہوگیا....... وہ بھی کچھ دنوں پہلے ہم کو چھوڑ کر....... پانی میں مچھی کے پیچھو چلا گیا ''....... پھر وہ سسکیاں لینے لگا۔

بمشکل میں نے اسے سنبھالا۔ میں نے دانیال کے ہاتھ میں اپنا وزنگ کارڈ دیا اور اُسے گھر آنے کی دعوت دیکر اپنی دلہن کے ہمراہ وہاں سے نکل پڑا۔

یہ کیا عجیب کھیل ہے جسمیں روزی ، راجہ ، دانیال ، مچھلی ، اور چاندنی رات اور سمندر ایک دوسرے سے جُٹ گئے تھے...... یہ کہانی ایک الف لیلیٰ کی داستان سے کم نہ تھی.......!

تعجب ہو رہا تھا کہ ایک مچھلی ایک مرے ہوئے انسان کا انتظار کر رہی ہے تو ایک لڑکی اپنے مرے ہوئے پریمی کا اور ایک شوہر اپنی بیوی کی اس دیوانگی میں برابر کا شریک ہوگیا ہے۔ بلکہ اس کو بھی یقین ہے کہ اس لڑکی کا ٹور ضرور لوٹ کر آیگا........

جب دانیال ہمارے گھر پہنچا تو رسمی باتوں کے بعد میں نے اس سے یوں ہی پوچھ لیا۔

'' دانیال تمہاری بیوی روزی اپنے محبوب کے لئے دیوانہ وار پھرتی رہی، تمہیں برا نہیں لگا؟

''نہیں ینگ میاں۔ آلویس روزی راجہ کا تھا...... اور ہم روزی کو چاہتا تھا۔ بس جس کو وہ چاہتا ہم بھی اس کو چاہتا۔ جس کا وہ دیوانہ ہم بھی اسکا دیوانہ... ''

لیکن دانیال جب تم روزی کے بہت قریب ہوتے ہوگے اسوقت تمہیں کیا لگتا تھا۔

How did you feel when you were very close with her ?.......

''مطلب جب ہم روزی سے لو کرتا ؟ ....

تب تو ادھر کوئی نئی ہوتا۔ وہ ایک ایک لفظ دبا کر بول رہا تھا... ''نہ میں ہوتا... نہ روزی... نہ کوئی اور...... اس وقت بس چاندنی ہوتا، سمندر ہوتا ہم کوئی نہ ہوتا۔ کوئی جسم نہ ہوتا، پر کیا ہوتا ہمیں نئ معلوم۔

ہاں...... ایک آواز ایک گہری آواز سنائی دیتی۔ "A deep full-Voice" جسمیں ہم گویا گم ہو جاتے...... وہ دیوانا وار بکتا ہی گیا اور ہنستا گیا۔

'' آواز۔ کس کی آواز ؟ کیسی آواز ؟ ''

ہم نہیں بتائیگا میاں۔ نائی...... نائی۔ اور ایک مغرور مسکراہٹ کے ساتھ اپنا وائلن لیکر دانیال باہر نکل گیا...... مجھے بھی تھوڑی دیر کے لئے یوں محسوس ہوا کہ کوئی گہری تعجب خیز آواز دانیال کا تعاقب کر رہی ہے۔

اس دن کے بعد دانیال کا کہیں پتہ نہ چلا۔

اور سائے بولنے لگے

اپنے اسٹار شپ میں سفر کرتے ہوئے کرۂ اُرض کی طرف برسوں بعد پھر وہ لوٹ رہا تھا۔ وہ کئی ستارے سیاروں کی سیر کر چکا تھا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ دوبارہ زمین پر آئے اور اپنی ماں سے، اپنی بہن سے اور اپنے رشتے داروں سے ملے۔ اسٹار شپ میں رکھے ہوئے برین اسکرین کو جب بھی وہ آن کرتا اسے اپنی ماں دکھائی دیتی۔ اُسے ایسے دکھائی دیتا جیسے اس کی ماں اسے بلا رہی ہے.......

ستاروں سیاورں کی دنیا عجیب ہے۔ وہاں ماں، بہن، بھائی، رشتہ داروں کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ اکیلی، جذبات سے خالی، زندگی ہوتی ہے...... اور وہ پھر اپنے رشتے داروں کو یاد کرنے لگا۔ جوں جوں زمین قریب ہوتی گئی ماں، باپ، بھائی، بہن سب کچھ اسے یاد آنے لگے۔ بیشک زمین ہی ایسی جگہ ہے جہاں آدمی آدمی سے جڑا رہتا ہے۔ ماں، باپ، بھائی، بہن رشتے دار کی آپس مین جذباتی ہم آہنگی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ آدمی اپنے سایہ سے بھی جڑا رہتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہے کہ

اس کا سایہ اسکا سب سے اچھا دوست اور رشتہ دار ہوتا ہے۔ بظاہر خاموش بے مقصد! شہر سے دور کسی پہاڑ پر اسٹارشپ کو اتارا گیا تھا جہاں آسمان کھلا تھا ورنہ اس شہر کو سائنس دانوں نے کسی خاص کیمیائی لیسر بیم سے ایسے ڈھک دیا تھا کہ اوپر سے آنے والے میٹیوزس (Metiors) یا کسی بھی نقصان دہ چیز اس چادر پار کر کے زمین تک پہنچ نہ سکتی تھی۔ زمین کے وقت کے حساب سے ایک صدی گذر چکی ہوگی جب کہ وہ دوبارہ زمین پر آیا تھا۔

اب تو یہاں سب کچھ بدل گیا تھا۔ انسان، انسان نہ رہے۔ وہ پیار محبت امن وآشتی سب کچھ بھلا چکے تھے اور بڑی عجیب بات تو یہ تھی کہ انسانوں سے انکے سائے الگ ہو چکے تھے۔ اور انسان خاموش بے حرکت بُت بن چکے تھے۔

اب سائے خود بولنے لگے تھے، ہنسنے لگے تھے، رونے لگے تھے۔اور رشتے نبھانے لگے تھے۔ بلکہ یہاں کی زندگی تو صرف سائیوں کی زندگی تھی۔

بہاریں، سمندر، سبزہ زار، ٹھنڈی ہوائیں، خوبصورتی سب کچھ سائیوں کو انسانوں کی طرح لبھاتی تھیں مگر انسانوں کو نہیں۔ اب محبت اور پیار انہیں سائیوں کے درمیان ہوا کرتا تھا اور انسان صرف بے جان بے حرکت مخلوق دکھائی دیتے تھے!

وہ اپنی ماں کے آگے زمین پر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ اسکے دل دماغ میں اک عجیب سی کیفیت ایک عجیب سی مُسرت تھی ماں سے ملنے کی!

مگر ماں۔ ماں صرف چپ سادھے اسے ٹکر ٹکر گھور رہی تھی۔ یہاں تک کہ جب اس نے اپنی ماں سے لپٹ کر رونا شروع کیا تو اس کی ماں چپ چاپ اس کا منہ تکتی رہی اور اس کی ماں کا سایہ اس سے بولتا رہا کہ کس طرح اُس نے انتظار کی گھڑیاں کاٹی تھیں۔ کسطرح بار بار اسے بیٹے کی یاد آیا کرتی تھی.....!

اس نے اپنی ماں کے سایہ سے پوچھا کہ لوگوں کو یہ کیسی چپ لگ گئی ہے، یہ کیوں خاموش ہو گئے ہیں، اور سائے کیوں انسان سے الگ ہو کر خود بولنے لگے ہیں۔ سائے نے اس کے جواب میں کہا کہ ''یہ سب کسی تین دیویوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ جب سے یہ تین دیویاں یہاں آکر ناچ گھر میں اپنا ناچ دکھانے لگیں ہیں سب کچھ بدل گیا ہے''۔

سایہ سے اسکی باتیں ہوتی رہیں۔ اسے معلوم ہوا کہ کئی لوگ ان دیویوں کے پیچھے سمندر میں جا کر ڈوب گئے تھے۔ بالکل کم لوگ رہ گئے تھے جو بچ گئے اور جن کے سائے الگ ہو کر متحرک ہو گئے تھے۔

باتوں باتوں میں شام ہو گئی۔ اسکی ماں کا سایہ اسے اس ناچ گھر کی طرف لے گیا جہاں ان تین دیویوں کا ناچ ہر شام شروع ہوا کرتا ہے۔

شام تھی.... مگر شام کے سورج کی کرنیں اس کیمیائی روشنی کی چادر پر پڑ رہی تھیں۔ اور چھن کر ہلکی سی روشنی میں تبدیل ہو گئی تھی...... اور پھر چاند کی کرنیں بھی سیدھے زمین پر کہاں پڑتی تھیں۔ اسی لئے سورج چاند مدھم مدھم دکھائی دیتے تھے اور نیلا آسمان پھیکا پھیکا سا لگتا تھا....

اب ناچ شروع ہوتا ہے....

پہلی دیوی بڑی خوبصورت حسین وجمیل ہے۔ پتلی کمر تیر کمان سی نظر، خوب اپنے کرتب دکھا دکھا کر لوگوں کا دل بہلا رہی ہے۔ لوگوں پر ایک سُرور، اک مدہوشی سی چھا گئی ہے۔ ناچ کے آخر میں اس نے سب کو نمسکار کیا۔

''لوگو اس 'جھوٹ' کا نمسکار قبول کیجئے'' اور سب کی تالیاں گونج اٹھیں ہیں۔

پھر ایک اور دیوی آگئی ہے۔

اس سے بڑھکر حسین۔ اس نے بھی خوب اپنے ناچ کا مظاہرہ کیا ہے۔ لوگوں پر جنون کا سا عالم طاری ہوگیا ہے۔ اسنے بھی ناچ ختم کر کے نمسکار پیش کیا ہے ''مجھے 'بدگمانی' کہتے ہیں۔ میرا بھی نمسکار قبول کیجئے!''....

اور تیسری بھی آئی، اس نے بھی اپنے حسن کے جلوے دکھائے، خوب خوب لوگوں کا جی بہلایا۔ اس نے بھی جاتے جاتے اپنا نمسکار پیش کیا۔ ''لوگو اس ناچیز کو 'نفرت' کہتے ہیں''۔

ناچ ختم کر کے وہ سمندر کی طرف چل پڑیں جہاں انکے تخت تیر رہے تھے۔

جب سے ان دیویوں کی پوجا ہونے لگی تھی، بھیڑ بکری دودھ دینا بند کر چکے تھے۔ دریاؤں کا پانی سوکھنے لگا تھا۔ اناج کھیتوں میں کم پیدا ہونے لگا تھا اور سب سے عجیب بات تو یہ کہ انسان اب چپ ہونے لگے ہیں۔ وہ کم ہونے لگے ہیں، جذبات سے خالی ہونے لگے ہیں اور پھر نہ جانے کیوں انسانوں کے سایوں میں وہ سب اوصاف آنے لگے جو کبھی انسانوں کے ساتھ منسوب تھے۔ اور جب یہ تبدیلی آنے لگی وہ انسانوں سے بالکل الگ تھلگ ہوکر اپنی ایک نئی زندگی بنانے لگے ہیں۔

زمین پر آنے والے نے یہ سنا اور یہ دیکھا تو اس نے سایوں کی خوب مذمت کی اور انہیں اکسایا کہ وہ اسکے ساتھ ملکر خوب روئیں، واویلا کریں اور.... اور جب سائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تو آنسوؤں کے دریا بہنے لگے اور پھر سے موسم خوشگوار ہونے لگے، پھر سے بہار آنے لگی، پھر سے سورج چاند کی کرنیں سیدھی زمین پر پڑنے لگیں۔ زمین کے اطراف لپٹی ہوئی کیمیائی روشنی اب چھٹنے لگی۔

یہ نظارہ دیکھ کر انسان گھبرا کر ان دیویوں کی طرف دوڑنے لگے اور سمندر میں کودنے لگے۔

آنے والے نے اپنی دوڑتی ہوئی ماں کو پکڑ لیا اور اسکے سائے کو حکم دیا کہ وہ اسکی ماں سے منسلک ہوجائے اور اس کا سایہ بن کر رہے۔

اسکی ماں کا سایہ پھر سے اسکی ماں کے جسم سے ملکر بے زبان خالی اور بے جسم ہوگیا۔ اور آنے والے کے حکم سے ایک ایک سایہ اپنے انسانی جسم کے ساتھ یوں ہی ملتا گیا۔ اب انسان پورا انسان ہوگیا اور...... رشتے ناتے بھائی چارگی، پیار و محبت کا ایک بار مجسم انسانوں میں پھر سے دور دورا ہوگیا۔

آنے والے نے دیکھا کہ سمندر میں اب پانی ابلنے لگا ہے اور ان دیویوں کے تخت پگھل کر اسی سمندر میں ڈوبنے لگے ہیں۔ اور یہ دیویاں انہیں تختوں کے ساتھ ڈوب گئیں ہیں۔

زمین پہ آنے والا شخص بہت خوش ہوا۔ اسے اس کی مجسم انسانی پیکر میں ڈھلی ماں صحیح و سلامت مل گئی تھی۔ یہ سب کچھ صحیح ہونے کے بعد آنے والا پھر واپس چلا گیا۔ مگر... شاید وہ پھر واپس آئیگا جب پھر سے کالے سائے بولنے لگیں گے۔

میری بیٹی

اور ایک بار پھر ویک اینڈ (Week end) آیا یعنی ہفتہ اتوار کی چھٹیاں ہوئیں۔

ایک بار پھر اسے اس کی شالنی نے فون کیا۔

اور ایک بار پھر وہ اپنی شالنی کے ریشمی بدن کی تپش تلے آنکھیں میچے گھر سے دور کسی بیچ رسارٹ (Beach Resort) کی کھلی فضا میں ستا رہا تھا۔

اپنے تناؤ، اپنی مشکلوں کو ذہن سے نکالنے کا اس سے بہترین ذریعہ اس کے لئے کوئی اور نہ تھا۔ یہ وہ دو دن تھے جس میں اسے ایک نئی دنیا میں پہنچ جانے کا احساس ہوا کرتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے اس کے لئے سب کچھ نئے سرے سے شروع ہو رہا ہے۔ نئے رشتے نئے ناتے، نئے تعلقات، نئے ڈھانچوں میں ڈھلے کسی نئی زمین سے اسکے لئے گویا ابھر گئے ہوں۔ انسان کا دوبارہ جنم ہو کہ نہ ہو اسے تو لگتا تھا کہ یہ ویک اینڈ اس کے لئے نئے جنم سے کم نہیں۔

اس دفعہ وہ سوچنے لگا کہ یہ کیسی دنیا ہے کہ اگر کوئی کسی ایک جنم میں کسی کا

رہتا ہو اور دوسرے جنم میں کسی اور کا، تو اسے کوئی غلط بات تصور نہیں کی جاتی، اور اس نئے رشتے میں بندھے پتی پتنی کو دوشی نہیں خیال کیا جاتا مگر اس جنم میں سوسائٹی نے جس کو ایک دوسرے سے باندھ دیا ہو وہ صحیح اور جو اس بندھن کے باہر ہو وہ غلط۔ حالانکہ وقت اور یادداشت ہماری قدروں، اصولوں کے اچھے بُرے ہونے کا کوئی آخری فیصلہ ہرگز نہیں کر سکتے۔ انسان اپنے پورے علم اور ہوش و حواس میں ایک جنم سے دوسرے جنم میں آنے کی کوئی دلیل پوری طرح نہیں پیش کر سکا۔ پھر بھی ایک احساس ہے جو شاید انسان کو پہلے یا دوسرے یا تیسرے جنم کے ہونے نہ ہونے کی جانکاری دیتا رہتا ہے۔

یہ سب احساس ہی کے بل بوتے پر تو طئے ہو رہا ہے۔ آدمی محسوس کرنے لگے کہ اسکا یہ دوسرا جنم ہے تو پھر اُس کو اس وقت کے نئے رشتوں، نئے بندھنوں، اور نت نئے امیدوں سے وہ کیوں دور بھاگے ؟

ویک اینڈ کے دو دن باہر گذارنے کے بعد وہ پھر گھر واپس آیا تھا۔

اس وقت وہ اپنے گھر والوں کے درمیان پوری طرح سرگرم تھا۔ اپنے رشتوں اور اپنی زمہ داریوں کو پوری طرح نباہ رہا تھا۔ نہ ہی اسکی محبوبہ شالنی اس کے ذہن میں بسی تھی اور نہ ہی ویک اینڈ بسا تھا، اور اب بسی تھی تو اس کی اپنی بیوی اور اکلوتی لڑکی سونیا اور اسکا پیار۔

یہی تو اس کا سب سے بڑا سرمایہ تھا۔

سونیا پکنک سے لوٹ آئی تھی۔ اپنے کالج کی لڑکیوں کے ساتھ وہ کوڈے کنال، پانڈی چیری اور نہ جانے کہاں کہاں گھوم پھر کر آئی تھی۔

اس دفعہ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔ اس کا صرف ایک سال گریجویشن کے لئے باقی تھا۔

ماں باپ کو معلوم ہی ہو جاتا ہے جب بچے غیر معمولی طور پر زیادہ ہی ہنستے بولتے ہیں۔

ماں نے سونیا سے پوچھا۔

کیا بات ہے بھئی، بہت چہک رہی ہو۔ کون سا تیر مارا ہے۔ ''تیر ویر نہیں۔ بس یونہی۔''

ہے تو کچھ بات۔

''ہوں۔ ہو بھی سکتی ہے......پر......''

بتاؤ بھی۔

''نہیں۔ نہیں۔ تم تو سن کر مجھے جیسے گلا ہی دبا دوگی۔ خیر جانے بھی دو مجھے تو اب پاپا کے پاس جانا ہے۔

سونیا، اپنے پاپا کے اسٹڈی میں داخل ہو کر چپکے سے اسکے سامنے آ کھڑی ہوگئی۔ اُسکے چہرہ پر ہلکی سی مسکراہٹ، آنکھوں میں شرارت تھی۔

کیا ہے سونیا بیٹی، کچھ خاص بات ہے؟

ہاں۔نہیں!

ہاں نہیں۔ ارے یہ کیا بات ہوئی۔ سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے؟

نہیں۔ہم۔نے کاٹیج نمبر 102 کے لوگوں کو دیکھا......

کیا۔ کیا۔ کیا مطلب!

''مطلب پاپا میں لڑکیوں کے ساتھ ادھر Reception کی طرف جا رہی تھی اور آپ لوگ وہاں سے کار میں بیٹھ کر نکل رہے تھے۔ میں نے بس ایک دو بار ہی انہیں دیکھا، شکل سے تو وہ بری نہیں..... پر آپ ہمیں بنا دیکھے ہی چلے گئے۔

ارے لڑکی کس کی بات کر رہی ہو۔ تم میرے ساتھ کسی لڑکی کو دیکھنے کی بات تو نہیں کر رہی ہو۔ ارے وہ۔ وہ تو میری......

''پاپا۔ گھبرایئے نہیں میں نے کچھ نہیں دیکھا میں کسی سے کچھ نہیں کہونگی۔'' وہ ہنستے ہوئے باہر چلی گئی۔

''ممی مجھے آپ سے بات کرنی ہے......

ہاں۔ بولو۔

''میں نے سنا ہے آپ میری شادی کی بات کہیں چلا رہی ہیں۔''

ہاں۔ تو ؟

''ممی......میں نے......''

میں نے، میں نے کیا ؟

''ممی، مجھے ایک لڑکا پسند ہے۔''

کیا؟!

...... کچھ دیر دونوں طرف خاموشی رہی......

کون ہے وہ؟ اگر لڑکا ٹھیک ٹھاک ہو، اچھے خاندان کا ہو تو اسکے متعلق سوچا جا سکتا ہے! میں تمہارے پپا سے بھی کہونگی۔ اب بتاؤ، وہ کون ہے، کیا کرتا ہے؟

ممی...... مجھے یقین ہے کہ آپ اسے ضرور پسند کروگی... مگر... ایک خاص بات ہے جسے آپ شاید پسند نہ کریں۔

اور وہ خاص بات کیا ہے؟

اوں۔آں...... ممی اس کی ایک بیوی ہے، وہ شادی شدہ ہے!

کیا۔ شادی شدہ سے تیری شادی! ۔ باؤلی ہوگئی کیا! ایسا سوچنے کی تجھ میں ہمت کیسے ہوئی توبہ... توبہ... "وہ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ ؟ ارے ان کا تو خون کھولنے لگے گا۔ غصہ سے پاگل ہو جائیں گے وہ!

"پر، ممی میں اسے چاہتی ہوں، اور وہ بھی مجھے بے حد چاہتا ہے۔"

"چپ کر لڑکی، اپنی اوقات میں رہ، بے ہودہ باتیں مت کر۔"

اور......ایک دو دن بعد

"ارے یہ کیا بکواس ہے سونیا۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں" ؟ تم کیا کہہ رہی تھی اپنی ممی سے، کسی شادی شدہ لڑکے کو تم چاہتی ہو؟ ہاں"

"پپا اس میں کیا بُرائی ہے۔ وہ اچھا لڑکا ہے۔ مجھ سے صرف دس بارہ سال بڑا ہے بتنے تیس پینتیس کا، خوبصورت نوجوان ہے اور ایک موبیل کمپنی کا مالک ہے کم از کم 40یا50 ہزار اس کی آمدنی ہوگی۔ اچھا سا ایک فلیٹ ہے اسکا۔ ایک اچھی سی گاڑی بھی لے رکھی ہے اس نے۔"

"تو۔ تو۔۔ یہ سب شادی کے لئے کافی ہے......ارے سماج میں ایک اچھی بھلی گریجویٹ کنواری ہونہار لڑکی کے لئے لڑکوں کی کوئی کمی ہے کیا جو اسے ایک شادی شدہ لڑکے سے شادی کرنی پڑ رہی ہے؟

لوگ تو شاید یہی سمجھیں گے کہ کوئی ایسی ویسی بات ہے۔

"پپا۔ آپ لوگ صرف لوگوں کے لئے ہی اچھی اور معمولی بات کو کیوں بُرا بنا لیتے ہیں، یہ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے......"

"پپا میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس سے کسی کو بھی شرمندہ ہونا پڑے مگر یہ بھی سچ ہے

کہ کسی دباؤ کے بغیر مجھے اشوک سے شادی کرنے میں کوئی برائی نظر نہیں آئی کیونکہ میں نے اسے پورے ہوش و حواس میں رہ کر چاہا ہے۔"

"سونیا، سونیا اب بس بھی کرو......"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

"سونیا، کہیں ایسا تو نہیں کہ تم ایسی بات کہہ کر مجھے ایک سبق دینا چاہتی ہو کہ میں خود شادی شدہ اور عمر رسیدہ ہوں اور اس کے باوجود ایک دوسری لڑکی سے تعلق رکھتا ہوں؟"

"اوہ۔ اوہ مائی ڈیر پپا۔ ایسا کیوں سوچ رہے ہیں آپ" ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں ممی کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ کسی بھی اچھے انسان کا جو ایک شادی شدہ مرد ہے کسی دوسری لڑکی سے پیار اور شادی کی خواہش کرنا کوئی غیر فطری بات نہیں۔ کیونکہ ایک اچھے مرد اور ایک اچھی عورت کا ایک دوسرے کو پسند کر لینا حالات پر نہیں دل پر منحصر ہوتا ہے......"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ ہر حال میں اس شادی شدہ مرد کی اپنی بیوی بچوں کے لئے تو ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔"

مگر وہ ان ذمہ داریوں کو برابر نباہ رہا ہے۔ کیا آپ نباہ نہیں رہے ہیں ؟

یہ سن کر وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اور کچھ دیر بعد سونیا کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"ایسا کچھ نہیں ہے پاپا میں تو جھوٹ بول رہی تھی، آپ کو ستا رہی تھی!!

سونیا کو دیکھنے لڑکے والے آرہے تھے، گھر سجایا گیا تھا۔ لذیذ کھانے

پکائے گئے تھے، گھر میں مسکراہٹیں ہی مسکراہٹیں ناچ رہی تھیں۔

اور ایک طرف سونیا اور اس کے پاپا کی گفتگو ہو رہی تھی، ''پاپا آپ کو تو پتہ ہی چل گیا کہ میں نے صرف ڈراما کیا تھا اور آج ممی کی مرضی کی مطابق یہ منگنی ہونے جا رہی ہے۔ آپ بالکل بے فکر ہو جایئے۔''

اب لوگ جمع ہو گئے تھے بس لڑکا اور اس کے خاص رشتے دار آنے کی دیر تھی...... سونیا کی ممی ان لوگوں کے استقبال کے لئے تیار کھڑی تھی۔

''ارے ارے تم...... تم شالنی میری اچھی سہیلی شالنی تم یہاں کیسے؟

''تجھے میرے بیٹے جیسا ہے جسے میں نے پال پوس کر بڑا کیا ہے اور اسے امریکہ بھیجا ہے۔ اب تو تم سمجھ گئی ہوگی کہ میں کون ہوں''؟

اور سونیا کی ممی بے حد خوش ہوئیں اور اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اور وہ شالنی سے لپٹ گئیں۔

''اجی سنتے ہو یہ تو اپنے ہی لوگ نکلے، جلدی سے آیئے...... جوں ہی سونیا کے پاپا نے ہال میں قدم رکھا وہ ٹھٹک گیا۔ اس کی زبان سے دھیمے لہجے میں نکلا''شالنی''!

''کتنی خوشی کی بات ہے کہ تجھے میرے بچپن کی چہیتی سہیلی شالنی کا بیٹا ہے...... اس کی بیوی اس سے کہہ رہی تھی مگر وہ سن نہیں رہا تھا۔ بلکہ شالنی کو بغور دیکھ رہا تھا۔ ایک عجیب پریشانی اس کے چہرے پر صاف نظر آ رہی تھی۔

اُدھر شالنی بھی بڑی عجیب حالت سے گذر رہی تھی۔ اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ قسمت نے اس کے ساتھ کتنا بڑا مذاق کیا ہے کہ وہ اپنی ہی بیٹی سمان سونیا کو بہو کے روپ میں دیکھ رہی ہے۔ دراصل اس رشتے کی بات کا اسے پورا پتہ ہی نہیں تھا۔ تمام معاملات شالنی کو

بتائے بغیر بنجے نے طے کر لئے تھے۔

شالنی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ سونیا اس کے اپنے ہی چہیتے پروفیسر اجیت اور کامنی کی بیٹی ہے۔ صرف ان لوگوں کی بنجے سے ہی بات ہوئی تھی کیونکہ بنجے نے ہی (Matrimonial Ad) دیا تھا اور اسی نے لڑکی پسند کی تھی۔ اور کوئی تفصیلات شالنی کو یہاں آنے تک معلوم نہ ہو سکیں۔

موقعہ پاتے ہی شالنی سونیا کے پاپا سے کہہ رہی تھی ''یہ سچ ہے کہ مجھے اس کا ذرا بھی علم نہیں تھا کہ سونیا آپ کی بیٹی ہے...... اور آپ ہی بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے......''

لڑکی کو ہال میں لے جایا گیا۔ ممی بہت خوش ہو رہی تھیں مگر پاپا اور شالنی پتہ نہیں کس الجھن میں پھنسے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

پاپا کیا آپ کو پتہ تھا۔ ؟

کیا بیٹا ؟

وہ آئی ہے نا

شالنی...... ہاں...... مجھے بھی پتہ نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے، نہ ہی اسے کوئی پتہ تھا...... اس نے مجھے ایسا ہی بتایا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سنجوگ کی بات ہے۔

پھر بھی پاپا یہ کیسا سچویشن ہے۔ شالنی جی ممی کی ایک طرف سہیلی ہے تو دوسری طرف آپ کا ان سے تعلق۔ بہت عجیب سا لگ رہا ہے۔ ایسے میں ہمیں اب کیا کرنا چاہیے۔

بیٹا وہ تمہیں پسند کر چکا ہے کیا تم بھی اسے پسند کرتی ہو۔

ہاں...... مگر

''تو ٹھیک ہے، ہم دونوں یعنی میں اور شالنی آج سے کسی طرح کا تعلق آپس میں نہیں رکھیں گے!'' یہ کہتے ہوئے وہ وہاں سے چلا گیا۔

مگر سونیا کے کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔

شادی کی تاریخ مقرر نہیں ہوئی تھی۔ سونیا کی ماں کامنی بار بار شالنی سے ملنے چلی جا رہی تھی، اپنی پرانی یادیں تازہ کرنے اور شادی کی تیاری کرنے۔

اور تھوڑے ہی دنوں بعد سونیا کے گھر یہ خبر پہنچی کہ کامنی اور شالنی جس کار میں گھر لوٹ رہے تھے اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور شالنی نے وہیں دم توڑ دیا ہے۔ اور کامنی ہاسپٹل میں زخمی اپنی آخری گھڑیاں گن رہی ہے۔

ہاسپٹل میں بنجے اور سونیا بلک بلک کر رو رہے تھے۔ سونیا کے پاپا بُت بنے کھڑے تھے۔ شاید انہیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ قدرت بنجے اور سونیا کے رشتہ کو منظور کر چکی ہے...... اور اب انہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ کیا ہو گیا

میں خاموش بیٹھا اپنے کئے پر پچھتا رہا تھا۔

ہاں۔، میں نے یہ کیا کیا؟

بس یہی کہ زبردستی اپنے لڑکے کی شادی کی، جب کہ وہ دماغی طور پر تیار نہ تھا۔ اس کے لئے اس کی مرضی کی کوئی لڑکی نہیں مل رہی تھی۔

مجھے تو یہ غم تھا کہ کہیں وہ بھی اپنے ماموں کی طرح بن بیاہے عمر گزار نہ دے، اس لئے ہم نے فوراً اس کی شادی کروا دی۔

قصہ مختصر......

اب وہ اپنی بیوی میں اتنا گم ہے کہ وہ ہماری کسی بات کو اہمیت نہیں دیتا۔

لوگ کہتے ہیں کہ لڑکی والوں نے کچھ جادو ٹونا کر دیا ہوگا ورنہ یہ ایسا لڑکا نہیں تھا کہ اتنا جلد اتنا بدل جائے۔

یہ جادو ٹونا ہو یا صرف عورت کا جادو؛ بات وہی ہوئی کہ ہم اس کی زندگی میں کسی حیثیت کے مالک نہیں رہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ سسرال والے اسکے اردگرد ہر وقت

منڈلانے لگے تھے۔ یہی چیز تو سب سے زیادہ ہمیں کھائے جا رہی تھی، بھلے ہی وہ ہمیں زیادہ اہمیت نہ دے پر وہ ہمارے ساتھ تو رہے، کم از کم سال دو سال ہمارے گھر بہو رہتی، اور بڑھاپے میں ہماری کچھ مدد کرتی، لڑکے کی محبت بھری بھولی بھالی صورت ہمارے سامنے ہوتی اور اس کی کمائی کا کچھ حصہ بھی ہمیں وقت بروقت ملتا رہتا......

یہ سب باتیں تھیں جو ہمیں کھائے جا رہی تھیں۔

مگر ہمیں محسوس ہو رہا تھا کہ ہم نے یہ شادی کر کے سب سے بڑی بھول کی ہے اور برسوں صبر اور محنت سے بنا ہوا یہ خاندان رات کے سپنے کی طرح ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا ہے۔

ہمارا یہ چھوٹا سا خاندان جس میں ہم ہماری بیوی اور چار بچے تھے آہستہ آہستہ ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ ہم اس موڑ پر آ پہنچے تھے جہاں سے پیسہ اور عزت ملتی ہے اور رہن سہن کے اسٹائل بھی بدل جاتے ہیں...... اسطرح ہم لوئر مڈل کلاس سے کچھ اپر مڈل کلاس میں داخل ہونے ہی والے تھے،...... شادی بیاہ وہ موقعہ اور وہ معاملہ ہوتا جس میں انسان کی عزت اور بڑھتی ہے اور رشتے اور مضبوط ہوتے ہیں۔ پر ایسا اس لڑکے کی شادی پر نہیں ہو سکا۔

بلکہ......

بہو نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا! اور ہم دیکھتے ہی رہ گئے۔ ہم تو بس اس بات سے ڈر گئے کہیں یہ لڑکی کچھ کر نہ لے اور ہمیں پولیس کچہری میں پھنسا نہ دے۔

ہم تو اسے اپنے خاندان کا حصہ مان کر چل رہے تھے پر تو ہر وقت اپنے ممی پپا ہی کی رٹ لگی رہتی تھی۔

چھوٹی چھوٹی باتوں پر اتنا ہنگامہ اور ایسی بدنامی کہ ہمیں محلہ بھر میں تماشہ

بننا پڑا۔ اور ہمارا دل بہت ٹوٹا۔ اتنا ٹوٹا کہ ہم اس سے بدلہ لینے کی سوچنے لگے۔

اس بارے میں سوچنے سمجھنے کیلئے کئی راتیں جاگ کر کاٹیں مگر راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور اسے سسرال والوں نے ملکر برین واش کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے گھیر لیا گیا تھا۔

مگر کسی طور ہم اس لڑکی کو سبق سکھانا چاہتے تھے۔ کیونکہ اسنے ہماری راتوں کی نیند حرام کر دی تھی اور دن کا سکون چھین لیا تھا آخر کیسے؟ آخر کیسے؟ ایک دوست نے صلاح کچھ اس طرح دی۔

''بھیا آپ کے لڑکے کو کسی اور لڑکی کے چکر میں ڈال دیجئے۔ تو تمہاری بہو ٹھیک ٹھاک ہو جائے گی، یا پھر لڑکا دوسری لڑکی کے ساتھ گلچھرے اڑاتا دیکھ کر گھٹ گھٹ مریگی۔ کچھ تو وہ بھی روئیگی! کچھ اسے بھی تو تکلیف ہوگی . . ہے نا؟

''ہے تو...... پر اسے کیسے کسی لڑکی کے پھندے میں پھنسایا جائے۔ لڑکی کہاں سے لائیں جو اس بات کو سمجھ کر ہمارا کام کرے۔'' ایک لڑکی میری نظر میں ہے، عمر میں کچھ بڑی ہے، ہو سکتا ہے کہ تمہارے لڑکے سے دو تین سال بڑی ہوگی، پر بلا کی ذہین لڑکی ہے، جو ٹھان لیتی ہے وہ کر گزرتی ہے''

''ارے تو کہاں ہے وہ لڑکی، کیا وہ روپیوں کے لئے یہ سب کرے گی؟

''ٹرائی کر لیتے ہیں، اور کیا؟

ہم تینوں لنچ کر رہے تھے۔

''میرے انام شوانی ہے۔؟

''میں، آنند؟

اور ہم نے اسے صاف بتا دیا کہ اسے کیا کرنا ہے؟

لڑکا ذرا ڈرپوک ہے، دیکھنا کہ تم کیسے اسے پٹا سکتی ہو۔ لڑکی مسکرائی اور کہا ''لڑکے کو کسی طرح مجھ سے ملا دیجئے۔ اسکے بعد دیکھا جائے گا۔''

اور اس طرح شوانی کو ہوٹل یادگار میں ایک ڈنر پر ملایا گیا جو کہ لڑکے کے پپانے اپنے لڑکے کو اس کے برتھ ڈے پر دیا تھا۔ دھندلی روشنی، بڑا ہال اور سرگوشی میں بولنے والے ویٹرس، لذیذ کھانے، اچھے خوبصورت کپڑوں میں ملبوس لوگ۔ اور کسی انگریزی فلم کی ہلکی سی دھن بجتی ہوئی ہو۔ اور خوشبو سے بھرپور ہال یہ تھی وہ رات جب اور جہاں شوانی نے بنجے سے ملاقات کی۔ شوانی جیسے انہیں اچانک مل گئی ہو۔

''ہلو انکل''

ہلو شوانی۔''

''بیٹا یہ شوانی ہے جو میری کبھی کلیگ تھی۔ میرے ریٹائر ہونے کے دو تین سال پہلے اس نے ہمارے دفتر جائن کیا تھا۔ بڑی اچھی اسٹونو ہے یہ۔ کام میں پرفکٹ اور دھن کی پکی۔

''شوانی یہ میرا لڑکا ہے بنجے، وہ یہاں ایک انجرنگ فرم میں کام کرتا ہے۔ بہت ہی شریف لڑکا ہے اس کی بیوی بھی انجینر ہے اس کا ایک بچہ بھی ہے۔ یعنی میرا پوتا، چنو منو سا، بڑا ہی نٹ کھٹ بڑا ہی سندر، گول گول سا۔ پیاری پیاری باتیں کرنے والا۔ دو سال ہے اس کی عمر۔ اور...... اور نام ہے اس کا کنال ......''

بنجے کے پپا نے ایک ہی سانس میں اتنا بڑا تعارف کروا دیا جب کہ اور سب

خاموش بیٹھے رہے۔

پھر یہ بھی اتفاق تھا کہ اگلے ہی ہفتہ بنجے اور شوانی نے کسی اور رسٹورنٹ میں ملاقات کی۔ اتفاق کبھی پیدا بھی کیے جاتے ہیں اور ایسا ہی ہوتا گیا۔ اتفاق پیدا ہوئے اور شوانی بنجے ملتے گئے۔

پھر آہستہ آہستہ دو تین مہینوں میں اتفاقات کا یہ سلسلہ باقاعدہ ملاقاتوں کا سلسلہ بن گیا۔ بنجے اب گھر دیر سے لوٹنے لگا اور اس کی دلچسپی اپنی بیوی اکا سے بھی کم ہوتی گئی۔ اکا اپنے میکے چلی گئی تھی...... وہ گھر سے فون کرتی رہی کہ بنجے آئے اور اسے گھر لے جائے۔ مگر بنجے کام کے بہانے اسے ٹالتا گیا۔ ظاہر ہے وہ کچھ دیر ہمارے گھر رک جایا کرتا اور بڑی دیر سے اپنی بیوی کے پاس جایا کرتا تھا۔

اس طرح تین چار مہینوں بعد اکا کو خود ہی بنجے کے گھر آنا پڑا بنجے اپنی بیوی بچے میں دلچسپی پھر سے لینے لگا۔ لیکن وہ ہر ویک اینڈ کو چھپے چھپے برابر شوانی سے ملتا رہا۔

ہم اندر ہی اندر خوش تھے ہمارا پلان کامیاب ہونے لگا ہے ہم ہر مہینہ شوانی سے خود ملکر اسے تین چار ہزار کی رقم دیدیا کرتے تا کہ وہ اپنا یہ کام جاری رکھے اور کسی طرح بنجے کو اپنی بیوی کے پیار سے ہٹا دے...... لیکن اچھے لوگ زیادہ دیر تک بُرے نہیں رہتے۔ بہو اکا دن بہ دن رنجیدہ ہوتی جا رہی تھی اور اپنے شوہر سے لڑتی جا رہی تھی۔ پھر بھی کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا بنجے پر۔ شوانی ادھر برابر اسے اپنی طرف کھینچتی رہی تھی۔

''دیکھئے نہ ابا کیا میری حالت ہو رہی ہے، بنجے میری پرواہ ہی نہیں کرتے کسی اور کے ساتھ گلچھرے اڑا رہے ہیں، آخر میرا کیا ہوگا، اس چھوٹے سے بچے

کا کیا ہوگا۔''

اور کچھ ہی دنوں میں مجھے محسوس ہونے لگا کہ ایک بیوقوف مگر اندر سے ٹھیک ٹھاک لڑکی کا گھر اجڑ جائے اور اپنے پوتے پر اس کا غلط اثر پڑے ایسا تو نہیں ہونا چاہئے۔

سچ تو یہ ہے کہ پوتے سے مجھے بہت لگاؤ تھا اس کی ضد اس کا ہمیں پریشان کرنا ہمارے لئے تکلیف دہ ہونے کے باوجود ہمیں اچھا لگتا تھا۔ اسے گودی میں لے لو تو اس کے نرم نرم جسم سے جو لہریں نکلتی تھیں وہ سیدھے ہمارے دل کے اندروں میں جا کر بیٹھ جاتی تھیں۔ اور اس سے جو ہمیں سُرور حاصل ہوتا تھا اس کا ایک الگ ہی نشہ ہوتا تھا۔ مجھے ایسے لگتا جیسے وہ میرے دیرینہ خوابوں کا ایک چمکدار ٹکڑا ہے۔

اب میں سوچنے لگا کہ کسی طرح میرے بیٹے کو اس لڑکی سے الگ کر دیا جائے جسے کبھی میں نے ہی اس سے چپکانے کی کوشش کی تھی۔

''دیکھو میں نے تمہیں جس کام کے لئے بلایا تھا وہ ہو گیا ہے نتیجہ میں جو دیکھنا چاہتا تھا وہ میں دیکھ چکا ہوں۔ لہذا اب تمہیں میرے لڑکے سے کنارہ کش ہو جانا چاہئے...... اور ہاں...... مجھے معلوم ہے کہ اس کی بھی کچھ قیمت ہونی چاہئے۔ چلو، میں تمہیں بیس ہزار روپیہ دینے کے لئے تیار ہوں......''

ہم مشہور رسٹورنٹ میں لنچ کر رہے تھے اور وہ میرے سامنے بیٹھی مسکرا رہی تھی۔

''وہ کیا ہے سر، آپ کا لڑکا مجھے بہت چاہنے لگا ہے اور بہت آگے بڑھ چکا ہے....''

''اچھا تو ۳۰ ہزار روپیہ ہی لے لو اور کسی طرح تمہارے لئے اس کے دل میں نفرت پیدا کر دو......''

''سر، روپیہ کی ضرورت شاید نہ ہو''

تو پھر ؟......

''آپ ایسا کیجئے کہ میں جیسے کہوں ویسے کرتے جایئے؟

تو تمہارے پاس کچھ پلان ہے؟

ہو سکتا ہے...... اس لئے آپ صرف کل شام ہوٹل سُو سُو میں ایک کمرہ ایک دن کے لئے...... اور وہ سرگوشی میں اپنا پلان مجھے بتانے لگی۔

ہوٹل سُو سُو میں ہم دونوں یعنی میں اور وہ لڑکی نیچے بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ شام کے کوئی چار بجے ہونگے۔ لڑکی نے نیچے سے فون پر بات کی اور اسے یہاں بلا لیا تھا، ایک طرح سے ہم دونوں اسے ویٹ کر رہے تھے۔

جونہی وہ داخل ہونے لگا ہم آہستہ سے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہال سے اٹھکر سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اور ہم ایسا دکھا رہے تھے جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں اور یہ سب اس طرح ہو رہا تھا کہ پوری طرح نیچے ہمیں دیکھ سکے۔

اور کمرہ نمبر ۳ میں ہم نے داخل ہو کر کمرہ بند کیا۔ ہمیں پوری طرح معلوم ہو چکا تھا کہ ہمارا تعاقب ہو رہا ہے۔ مجھے کچھ اندر سے بیقراری سی ہو رہی تھی کہ اب لڑکے کا ری ایکشن (Reaction) کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ آکر دروازہ کھٹکھٹائے یا کالنگ بل پر زور آزمائے۔ پر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ شاید وہ چلا گیا۔

کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد میں نے نکل جانے میں اپنی بہتری سمجھی ... پر نہ جانے کیوں ایسا ہوا نہیں۔

میں اِدھر کھلے دروازے پہ کھڑا تھا۔

آدھا اندر آدھا باہر، ایک لمحہ کے لئے میں نے مڑ کر دیکھا..... اس نے بھی میری طرف دیکھا اور...اور...... بیس ہزار کا چک پھاڑ کر اس کے ٹکڑے ایک کونے میں لڑکی نے پھینک دیئے۔ کچھ دیر کے لئے میری اور اسکی نگاہیں ملیں۔ پتہ نہیں ان نگاہوں میں کیا تھا کہ میں چاہ کر بھی کمرہ چھوڑ کر نکل نہ سکا۔

اسے معلوم تھا کہ میری زندگی کا ساون ڈھل چکا ہے۔ میرے متعلق اسے سب کچھ معلوم تھا، میرے خاندان کے افراد کو وہ غائبانہ جانتی تھی۔ پھر بھی مجھے ایسا کیوں لگا کہ ایک پیار کا بہتا دریا اس کی طلسمی نگاہوں سے امڈ کر میری طرف آرہا ہے۔ اس دیوی کے آگے میں کچھ نہ کر سکا۔ میں نے اپنے آپ کو سمیٹنا شروع کیا۔ اور دل اور جسم میں برقی رو دوڑنے لگی۔ پھر میں نے آنکھیں بند کرلیں شرم وحیا سے اخلاق و آداب سے!

تین سال بعد ہم اپنی سب سے چھوٹی سالی کی شادی میں شریک ہونے کے لئے حیدرآباد گئے۔ حیدرآباد میرے لئے نیا شہر نہیں تھا۔ کئی دفعہ میں نے حمایت نگر کے شادی خانہ دیکھے تھے ہر ہر دفعہ مجھے حیدرآباد میں ایک اپنا پن نظر آیا۔

شادی گھر میں بڑی رنگینی اور روشنی تھی۔ میری چھوٹی سالی حیدر آبادی دلہن کے روپ میں سجی سجائی اسٹیج پر بیٹھی تھی، اور اُسے گھیرے دلہن والے کھڑے تھے۔ دوسری طرف دولہا حیدرآبادی شروانی اور عمامہ میں ملبوس ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جس کے اطراف دولہا والے اپنے اپنے بہترین لباسوں میں ملبوس کھڑے تھے۔ حیدرآباد کی تہذیب اس ہال کو زینت بخش رہی تھی۔ اس گہما گہمی سے دور شادی محل کے گیٹ کے قریب اپنی واکنگ اسٹک لئے میں آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا۔

اب میری کمر کسی قدر جھکی ہوئی تھی۔ آنکھوں پہ موٹا چشمہ لگا تھا۔ میں کسی (Oddman Out) کی طرح اپنی نگاہوں سے گویا زمین کرید رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرا ہاتھ تھام کر کہا...... ''ہلو''

آواز نسوانی تھی۔ شہد میں ڈھلی ہوئی اس آواز کی طرف میں نے مڑ کر دیکھا......

کیا آپ نے مجھے پہچانا نہیں ؟ ۔

''نہ.......نہ ''

غور سے تو دیکھئے؟

میں نے غور اُسے دیکھا... یہ ایک جوان عورت تھی جس کے ہاتھوں میں ایک ننھی سی میٹھی سی بچی تھی.......! اب بھی نہیں پہچانا آپ نے؟ مجھے دھیرے دھیرے یاد آنے لگا...... نرم شام کی دھیمی روشنیوں میں اس آواز کی سرگم نے میرے اندر کی کتاب کے باب کھول دیئے۔ ''تم...... شوانی ہو نا؟ ''ہاں میں وہی ہوں اور یہ میری بچی ہے مگر آپ یہاں؟۔ یہ میری چھوٹی سالی کی شادی ہی تو ہے....... '' اورتم؟'' کچھ دیر وہ خاموش رہی پھر اس نے بولنا شروع کیا۔ ''پروفیسر دھیرج سے میری شادی ہوئے دو سال ہوئے ہیں جو حیدرآباد میں رہتے ہیں۔ ہماری شادی کے وقت اس بچی کی عمر چھ مہینوں کی تھی۔ پروفیسر دھیرج وہاں بیٹھے ہیں، وہ دیکھو - چلئے آپ کو ان سے ملاؤں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے میرے ہاتھ سے چھڑی لے لی اور اپنی بچی کو میری گودی میں دیدیا۔

اور ہم کسی خاص کرسی کی طرف بڑھنے لگے سچ تو یہ ہے کہ مجھے بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ اور ایک انجانی خوشی مجھے گھیر رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے میری کمر

اکڑی ہوئی نہیں تھی اور جیسے مجھے واکنگ اسٹک کی کوئی ضرورت نہیں ہے،....... چلتے چلتے اس نے ایک بات آہستہ سے میرے کانوں میں کہی جس پر میں چونک اٹھا۔

میں نے اس بچی کی طرف غور سے دیکھا، کچھ دیر کے لئے اسے چمٹائے رکھا، بچی کو پیار کیا جس پر شوانی کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ یہ دیکھ کر میری آنکھیں بھی بھر آئیں۔ پھر میں نے اس بچی کو اس کے حوالے کر دیا۔ اور دھیرج سے ہاتھ ملانے کے لئے اب ہم آگے بڑھ گئے۔ میں نے محسوس کیا پروفیسر دھیرج کے ہاتھ بہت ہی ملائم ہیں۔ میرے ہاتھوں سے بھی ملائم۔ وہ بڑا اچھا انسان ہے اور اس سے خوب باتیں ہوئیں۔

اس کا کہنا تھا کہ عورت کبھی گناہ گار نہیں ہو سکتی۔ وہ صرف نادان ہو سکتی ہے اور مرد ہی اس کی نادانی کا فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔ یہ سن کر میرے اندر عجیب کسمساہٹ ہوئی اور.......اور۔ میں نے اپنی واکنگ سٹک لے لی، پروفیسر اور شوانی سے معذرت چاہی اور وہاں سے نکل گیا!

بی ماں

وہ تھی بھی ایک عجیب عورت۔

وہ اپنے آپ بڑبڑاتی۔ اپنے آپ ہنستی، روتی تھی۔

ہاں یہ بات تو سچ ہے کہ اس گھر میں جہاں وہ رہتی تھی اسکا بھلائی چاہنے والا کوئی نہیں تھا۔ کسی کو پرواہ نہیں تھی کہ وہ کیا کھاتی ہے کیا پیتی ہے۔ نام تھا اسکا بیابی لیکن سب اسکو بی ماں کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ بی ماں کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ پر وہ اس گھر سے جڑی ہوئی تھی۔ اسی گھر سے اور اس گھر کے لوگوں سے گویا اس کی رشتہ داری تھی۔ اس کی ماں اس گھر کی خادمہ تھی اسلئے بچپن سے وہ اسی گھر کی ہو کے رہ گئی۔ تین سال ہوئے ماں اسے چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔

اس گھر سے اس کا تعلق بہت گہرا تھا۔ بی ماں، بی ماں کی ماں، اور اسکی ماں سب اسی گھر کی خادمائیں رہ چکی تھیں۔ یہ گھر بڑا ہی متمول خاندان والوں کا گھر تھا جہاں ایک ایسی خادمہ ہوا کرتی جو گھر کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے کام کے لئے ہر وقت تیار رہتی تھی۔

باہر کے کام کاج، خصوصاً سودا سلف لانے کا کام تو بڑا ہی ذمہ داری کا کام تھا اور اسی لئے یہ کام گھر کی خاص خادماؤں کے سپرد تھا۔ بی ماں اس گھر کی خاص خادمہ تھی۔

وہ ٹھیک گیارہ بجے مارکیٹ کے لئے نکلتی، جو گلی کے نکڑ پر بنا تھا۔

گوشت، مچھلی، جھینگا، چاول گیہوں، املی، ناریل- یہاں سب کچھ مہیا تھا۔

جب بی ماں مارکٹ کے لئے نکلتی تو اڑوس پڑوس میں سب کو پتہ چل جاتا کہ وہ مارکیٹ جارہی ہے۔ اب کیا کیا جائے کہ اسے چیزوں کو یاد رکھنے کے لئے دماغ کا استعمال کم اور زبان کا استعمال زیادہ کرنا پڑتا تھا۔ اسی لئے وہ راستہ بھر اپنی زبان سے خریداری کی فہرست دہرائی چلی جاتی تھی، وہ بھی بہت ہی بلند آواز میں.......

''آٹھ آنے کا گوشت، دو آنے کے آلو، ایک آنہ کا ناریل.......

ایک آنے میں ہرا مصالحہ.......'' بی ماں یاد کرتی جاتی تھی اور ادھر گلی کے لڑکے بھی نقل اتارتے وہی کچھ دہراتے چلے جاتے ''آٹھ آنے کا گوشت، دو آنے کے آلو وغیرہ''

''مُنہ جلے بھاگو یہاں سے، بڑے آئے نقل اتارنے والے، بھاگو ورنہ مُنہ توڑ دوں گی.......''

اس کی اس بری عادت پر گھر کے لوگ نالاں تو تھے ہی مگر گلی کے لڑکوں کے لئے اس کی نقل اتارنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔

سامنے گھر والی خادمہ گوری ماں اس عادت سے اسے باز آنے کے لئے کہتی لیکن اس کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کیوں کہ گوری ماں جیسی ذہین تو وہ تھی نہیں۔

بی ماں جہاں کام کرتی تھی وہ بہت پرانی کوٹھی تھی اور محلّہ کا مارکیٹ اس سے بھی پرانا۔ بی ماں کے بچپن میں جو لوگ یہاں دکانیں لگایا کرتے تھے انہیں کی اولاد اب ان

دکانوں پر بیٹھتی تھی۔

بی ماں کی ماں کی شادی اسی گھر والوں نے کی تھی پر شادی کے کچھ ہی دنوں بعد بی ماں کا باپ رنگون چلا گیا اور پھر کبھی واپس نہ لوٹا تھا۔ اُسے بڑی ماں سے لے کر چھوٹے با، چھوٹی ماں اور اب بڑے بھیا بھابھی کا زمانہ دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ بی ماں اب تقریباً ۴۵ برس کی ہو چکی تھی۔ خاصی موٹی اور کافی چست!

زمانے بدلے، بازار میں قیمتیں بڑھ گئیں، اور گلی میں بھیڑ بھاڑ۔

مگر یہ محلّہ اور اسکے لوگوں کے ذہن نہیں بدلے تھے۔

بی ماں اس عمر میں بھی گلی میں بلند آواز سے سودا سلف کی لسٹ دہراتی چلی جاتی تھی۔

''دو آنے کی پیاز....... چار آنے کی بطلی (ایک قسم کی چھوٹی مچھلی).......''

''ارے بوا تو اتنا زور زور سے کیوں بکے جاتی ہو، اس طرح زور زور سے اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی؟ تمہارے گھر والوں کا بھانڈا پھوڑ کے رکھ دیتی ہو....... کیا وہ تجھے منع نہیں کرتے؟''

''کیا کروں گوری بو عادت جو ہو گئی ہے.......''

''اچھا یہ تو بتا کہ اتنے بڑے گھر کے لئے دس روپیہ کی چیزیں کافی ہوں گی بھلا؟''

''تم ہی بتاؤ کوئی چیزیں کیا خریدے جب اتنی مہنگائی ہو گئی ہے۔ کہاں میری ماں سارے کا سارا بازار صرف دو ڈھائی روپیہ میں لے آتی تھی اب کہاں دس روپے خرچ کر کے بھی کچھ خاص خریدی نہیں ہو سکتی۔ اور تم ہی بتاؤ اب اگر ایک آدھ ہڈی گوشت کے ساتھ قصائی مُوا ڈال دے تو اکیس میرا کیا قصور ہے، پر مالکن دیکھو چلاتی

رہتی ہے کہ میں ہڈیاں سمیٹ لاتی ہوں اور پیسے اکارت کرتی ہوں...... اور وہ قصائی بابو لال...... بڑی گندی زبان ہے اسکی۔ کہتا ہے "بی ماں تمہارے جسم میں دیکھو کتنی ہڈیاں ہیں تو ایسے کیسے ہوسکتا ہے کہ بھیڑ بکرے کی ہڈیاں نہ ہوں، گوشت سے لگی ہوئی ہڈی تو ہوگی نا۔"

گوری بُو نے بات کو بدل کر پوچھا، اچھا یہ تو بتا نا کہ تمہاری بھابی تمہاری شادی کرنے والی تھی اس کا کیا ہوا؟

"ارے ان کا بس چلے تو ابھی نکاح پڑھوا دیں لیکن میں ہی منع کر رہی ہوں.... میں چالیس کے اوپر کی ہوگئی ہوں، مجھے اس گھر کا کام کرتے ہی فرصت کہاں ملتی ہے جواب میں شادی کرلوں۔ اس گھر کا کام کاج کون کریگا آخر اس گھر کے تئیں میری بھی کچھ ذمہ داری ہے نا۔"

"اری کیا ہوا جب خود ہی وہ لوگ تمہاری شادی کر رہے ہیں تو کرلو ورنہ پھر موقع نہیں ملے گا۔"

"ارے کیا کرلوں؟ ایک تو گھر کی ذمہ داری اور وہ مُوا ابھی کوئی ڈھنگ کا نہیں ہے خالی چیلی کا ٹیلر ہے۔ "مارو تو ٹا کا ورنہ فاقہ" اور شکل بھی کتنی منحوس ہے اس کی، اور کیسے دیکھنے لگتا ہے مجھ کو جب اس کی دکان پر سے گذرتی ہوں...... جیسے کسی عورت کو کبھی نہ دیکھا ہو...... یہ مرد کی ذات بھی بڑی خراب ہوتی ہے۔ انکا بس چلے تو عورت کو آنکھوں سے ہی نگل جائیں۔

......اور یہی باتیں ہوتی چلی گئیں.......

بھاری بھرکم بی ماں کی شادی آخر ہو کر رہی۔

آج بھی وہ اس گھر کی زیادہ تر دیکھ بھال میں مصروف ہے۔ سودا سلف لے آنا

آج بھی اسی کا کام ہے۔ چھوٹے بڑوں کی صلواتیں سننا۔ اور بڑی رات گئے دیوڑھی کے راستے سو رہنا۔ اور پھر صبح پانچ بجے اٹھ بیٹھنا۔ یہی اس کا معمول ہے گویا وہ انسان نہیں ایک مشین ہے۔

اس وقت بڑی بھابی کی طرح اس کو بھی بچہ ہونے والا تھا۔

اسے یاد آیا آج اس کی ماں کی برسی ہے، دکھ ہوا اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ کام کاج ختم کر کے وہ شام ڈھلے ایک آنے کی بوندی لئے قبرستان نکل پڑی۔ ویسے بھی وہ ہر جمعرات یہاں حاضری دیا کرتی تھی اور اپنے دکھ سکھ کی کہانی اپنی ماں کو سنایا کرتی تھی اور اس سے مدد مانگا کرتی تھی۔

اماں کی قبر پر بیٹھے وہ رو رو کر آنسو کے پھول چڑھانے لگی۔ اور کہتی رہی "میری پیاری اماں، تم مجھے کیا چھوڑ گئیں، میرا دکھڑا سننے والے کوئی نہیں۔ اماں جی تم ہی نے تو میرے خواب میں آ کر بتایا تھا کہ مجھے شادی کرلینی چاہیے اس لئے میں نے ہاں کردی۔ اب مجھ پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں دیکھو۔ میں ماں بننے والی ہوں اور یہ بوجھ ڈھوتے ڈھوتے صبح شام محنت کرنی پڑتی ہے۔ ہم غریبوں کی کون سنتا ہے، سب اپنے اپنے کام کروانے میں لگے رہتے ہیں۔ بڑی بھابی، چھوٹی بھابی، چنو، منو، بڑے بھیا سب یہی کہتے ہیں کہ بی ماں اب ٹھیک سے کام نہیں کرتی پر یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ میری طبیعت کیسی ہے، کیا کھاتی ہے، کیا پیتی ہے، اور پھر سب کو یہ اعتراض رہتا ہے کہ میں اپنے آپ بکتی رہتی ہوں اور گھر کے سارے معاملے باہر کے لوگوں کے کانوں تک پہنچا دیتی ہوں۔ پر میں کیا کروں اماں یہ میری عادت ہے۔ جان بوجھ کر تو کرتی نہیں، اماں میرا مرد بھی کیا خوب ہے۔ موا کالے شاہ روزانہ پندرہ روپیہ کیا کماتا ہے اور بیڑی سگریٹ، پان اور کبھی سیندھی پر اڑا دیتا

ہے۔ مجھے ناس کے لئے بھی دوسروں سے مانگنا پڑتا ہے۔ اماں یہ مجھے مرد بچہ ہونے دے۔ بچی ہوگی تو میری جیسی اس کی حالت خراب ہو جائے گی اور وہ بھی اس گھر کی خادمہ بن کے رہ جائے گی.......'' وہ اس طرح فریاد کرتے کرتے زار و قطار رونے لگی۔

بڑی بھابی کے پیر بھی بھاری تھے۔ اور ان کی زچگی بھی تقریباً اسی وقت ہونے والی تھی جس وقت بی ماں کی۔ مگر بی ماں کو وہیں دیوڑھی کے قریب سونا نصیب ہوا تھا، خادمہ جو ٹھہری۔

شہر میں اس دفعہ زبردست طوفان اور بارش ہوئی جس کی وجہ مدراس (چینئی) میں سیلاب آگیا تھا اور گلیوں سڑکوں پر تین دن تک دو تین فیٹ پانی کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ مونٹ روڈ کی حضرت سید موسیٰ قادری والی درگاہ میں بھی پانی گھس آیا اور دو تین راتوں تک کسی گھر یا کسی گلی کوچہ میں برقی چراغ نہیں جلے تھے۔ مگر خدا کی قدرت حضرت کی درگاہ میں مزار مبارک پر برابر برقی چراغ جلتے رہے۔ یہ کتنی بڑی کرامت تھی!

اس کرامت کو سن کر لوگ جوق در جوق حضرت کی مزار پر اپنی مرادیں مانگتے آنے لگے تھے۔

بی ماں بھی مٹھائی اور دو لڑ پھول لیکر درگاہ شریف پہنچ گئی۔

''اے حضرت مرد بچہ مجھے عطا فرمائیں، میں آپ کے حضور میں چادر پیش کروں گی اور گھی کے چراغ جلاؤں گی.......'' اور ایسا ہی ہوا، دونوں کے مرد بچے ہوئے۔ بڑی بھابی کے بچے کی خوب تعریفیں ہوئیں۔ چلہ، چھٹی زور شور سے ہوئے۔ مگر بی ماں کا بچہ، وہ تو ایک غریب کا بچہ تھا۔ وہ تو اس گھر کی دیوڑھی میں پڑا رہا۔

دن رات تو گذرتے رہتے ہیں۔ بی ماں کے مرد کو گالی گلوچ کر کے بڑے گھر والوں نے بھگا دیا۔ اور پھر وہ بیچاری بی ماں اکیلی رہ گئی۔

دن گذرتے گئے۔ آزادی ملی۔ جس کالے شاہ کو بھگایا گیا تھا وہ کچھ ایسے کام دھندے میں لگا کہ اس کے بھی دن بدلنے لگے۔ اس نے کسی جھینگوں کے بیوپاری کے ہاں نوکری کر لی جو ایک ایم ایل اے تھا اور جس کا حکومت میں بڑا رسوخ تھا۔ اور یہ MLA بہت جلد کروڑ پتی بن گیا کیونکہ نئی سیاست کو وہ پہچان چکا تھا۔ اسی کے پاس نوکری کرتے کالے شاہ بھی اس دھندے کے نکات سے مانوس ہو گیا اور وہ بھی دیکھتے ہی دیکھتے بڑا آدمی بن گیا۔ اب وہ جھینگوں کا اکسپورٹر تھا۔

ادھر بڑے گھر کے بڑے لوگ دیسی حکومت اور جمہوریت کے ریل پیل میں پستے گئے اور چھوٹے ہوتے گئے۔ سیاسی بدلاؤ کے ساتھ طرزِ زندگی میں بدلاؤ آتا ہے اسی کو سمجھ کر جو لوگ بدلتے ہیں وہ اپنا وقار نہیں کھوتے مگر بی ماں جہاں رہتی تھی اُس گھر کے لوگ وہیں کے وہیں رہ گئے۔

کالے شاہ نے طرزِ زندگی بدلی۔ اور اس نے بی ماں کو اپنے پاس بلانے کی ٹھان لی۔ اور بڑے گھر پہنچ کر اپنی بیوی کو ساتھ لیجانے کی خواہش ظاہر کی۔

''ہاں بھابی اب آپ کا بھی کچھ بوجھ ہلکا ہو جائیگا۔ اس لئے مجھے اب اس کے ساتھ جانے دے دیجئے؟''

''اچھا اب تُو بھی ہم کو چھوڑ کر جانے لگی ہے؟''

''ایسی بات نہیں اس وقت آپ کو پیسے بچانے کی بہت ضرورت ہے۔ میں ضرور آتی رہوں گی''۔ اور اس طرح بی ماں اپنے شوہر کے ساتھ ایک چھوٹے سے مکان میں شہر سے دور رہنے لگی اور کچھ ہی دنوں بعد اس نے ایک پلاٹ بھی خریدا اور

اس پر ایک مکان بھی تعمیر کرلیا... اس کے دو بچے ہوئے، دونوں مرد بچے دیکھتے ہی دیکھتے بڑے بھی ہو گئے اور اپنے ہی باپ کے ساتھ کام پر لگ گئے۔

بی ماں کی اُداسیاں دور ہونے لگیں، اس کی خود کلامی کی عادت بھی رفتہ رفتہ چھوٹ گئی۔ اس کی زندگی میں اب خوشیاں آنے لگیں۔ اس کی ہم کلامی کی خاصیت کہاں گئی اسے پتہ تک نہ چلا اور اپنی زندگی میں وہ اتنی مگن ہو گئی کہ ہر جمعرات اپنی ماں کی قبر پر فاتحہ دینا، ماں سے مشورہ کرنا یہ سب بھول گئی....... وہ بہت کچھ بھول گئی تھی....... بہت کچھ.......

اُدھر بڑے گھر کی حالت دن بہ دن بگڑتی گئی۔ وہ برٹش دور کی ٹھاٹ باٹ سب ختم ہونے لگی۔ بچے ناکارہ ثابت ہوئے۔ وہ نئے دور سے ناتہ نہ رکھ سکے۔ وہی اکڑ وہی بد دماغی کی باتیں۔

بی ماں کو اس کی ماں کی یاد ستانے لگی۔ اُسے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کئی سالوں سے ماں کی مزار پر نہیں گئی تھی۔ قبرستان میں بی ماں اپنی ماں سے گویا کہنے لگی تھی.......

''مجھے معاف کرنا ماں، میں آنہ سکی، اب مجھے اپنے دونوں بچوں کی شادی کرنی ہے.......'' اور یہ سب بہت سرگوشی میں وہ کہتے جا رہی تھی۔ مگر پاس ہی کسی عورت کی بلند آواز سنائی دینے لگی۔ وہ عورت گویا اپنے شوہر کی مزار پر بیٹھے رو رہی تھی، شکایتیں کر رہی تھی۔ اس کی ہر بات، ہر شکایت، ہر واویلا سب آس پاس کے لوگ سن رہے تھے۔

''دیکھو میرے آقا، مجھے سب چھوڑ کر چلے گئے۔ آپ کیا گئے میرے بچے، میرے نوکر چاکر سب مجھے چھوڑ کر چلے گئیں....... گھر بھی فروخت ہو گیا، میں نیلم پاشاہ کے محلہ کی ایک چھونپڑی میں آپڑی ہوں۔ کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔

کیا کروں، کیا کروں،....... بیماری نے مجھے آگھیرا ہے، پتہ نہیں کیا ہو گا۔ حالت ایسی ہے کہ میں پوری بے پردہ ہو گئی ہوں صرف چادر لپیٹ کر باہر آتی جاتی ہوں....... میں کیا کروں میرے آقا! میں کیا کروں.......''

آواز جانی پہچانی تھی۔ بی ماں نے قریب سے جب اُس عورت کو دیکھا وہ چونک پڑی.......

بڑی بھابی آپ!

آنسوؤں کے سیلاب کے ساتھ وہ عورت بی ماں سے لپٹ گئی۔

دنیا ایک بڑا اچرج ہے۔ کبھی جو سوسائٹی میں نیچے تھا وہ اوپر آجاتا ہے اور جو اوپر ہوتا ہے نیچے چلا جاتا ہے۔ مجبوری اور غریبی کسی سے خود کلامی کرواتی ہے تو تونگری دوسروں پر رعب جمانا اور دوسروں کی آزادی چھین لینا سکھاتی ہے۔

بی ماں اب اپنے آپ سے باتیں کرنا چھوڑ چکی ہے..... اور بی ماں آہستہ سے بڑی بھابی کو اپنے ساتھ لے کر باہر نکل جاتی ہے۔

ہر دور میں شاید تاریخ پھر سے خاندانِ غلامان (Slave Dynasty) کو زندہ کرتی ہے!

رپورٹر

'' تو آپ ہیں رپورٹر راجو۔ اور آپ ہمارا انٹرویو لینا چاہتے ہیں؟''

جی ہاں۔ مجھے ایک پراجکٹ دیا گیا ہے کہ ریٹائیرڈ لوگوں کے کیا مسئلے ہوتے ہیں۔ اور انکے لئے بیت المعمرین (Old age home) ضروری ہے کہ نہیں ؟

'' ارے بھائی آپ پیپر والوں کو تو معمولی باتوں کا بتنگڑ بنانا بخوبی آتا ہے۔ اور ہر جگہ یا تو آپ کو سکنڈل دکھائی دیتا ہے یا سیاست۔

'' مگر ہر وقت ایسا نہیں کیا جاتا۔ '' بہر حال آپ انٹرویو کیلئے برائے مہربانی تیار ہو جائیں۔ میں آپ کا اور آپکے گھر والوں کا اس ضمن میں انٹرویو لینا چاہتا ہوں اور انکے خیالات جاننا چاہتا ہوں۔

'' کیوں نہیں :۔ مگر پہلے کچھ چائے وائے تو ہو جائے '' یہ کہتے ہوئے معمر انسان نے اندر آواز دی۔ '' بہو ذرا چائے بھجوانا۔ مہمان آئے ہوئے ہیں۔''

رپورٹر اس دوران اپنے آس پاس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ ایک تین منزلہ

اپارٹمنٹ کے ایک چھوٹے سے ہال میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس مکان میں دو کمرے تھے، ایک چھوٹا سا ہال درمیان میں، اور ایک کچن اور ٹائیلٹ۔ ہال میں ایک صوفہ سیٹ رکھا ہوا تھا۔ ایک چھوٹی میز تھی، موزائیک کا فرش تھا اور پینٹ کی ہوئی دیواریں۔ یہ گھر بڑا خوشنما لگ رہا تھا۔ یہ سلیقہ دار کلچرڈ لوگوں کا گھر لگ رہا تھا۔

عمر رسیدہ آدمی نے پھر سے آواز دی۔

'' بہو چائے جلدی لانا ''....... !

''لاتی ہوں، لاتی ہوں''

وہ ایک جوان عورت تھی جو کچن سے باہر نکلی تھی، ایسا لگتا تھا جیسے ابھی ابھی نہانے سے وہ فارغ ہوئی ہے۔ اس کے بال بھیگے ہوئے تھے۔ مختصر سی بھیگی چولی پر ایک پتلی سی اوڑھنی ڈالے وہ بے دھڑک چلی آئی تھی۔ گول سفید نم چہرہ، چمکتی گول آنکھیں، دائرہ نما سرخ ہونٹ، میانہ سڈول جسم.......

'' یہ میری بہو ارونا ہے '' عمر رسیدہ شخص نے کہا۔

نمستے ۔

نمستے....... '' یہ میرے بڑے لڑکے دھرم کی بیوی ہے....... جو ایک اکسیڈنٹ میں مارا گیا....... اور یہ اب ہمارے ہی ساتھ رہتی ہے۔

ارونا کو اسطرح سے دیکھ کر رپورٹر کچھ سہم سا گیا۔ پھر بھی اس نے چائے ختم کر کے اپنا کام شروع کر دیا۔

آپ کا نام ؟

پرکاش ؟

تعلیم ؟

ایم ۔ اے ۔

مقام پیدائش ؟

'' مدراس ۔ ملازمت مدراس اور شاید خاتمہ بھی مدراس میں ہی ہو، سکریٹریٹ میں سکشن آفیسر کے عہدے تک پہنچ کر ریٹائر ہوا ہوں ۔

'' آپ کیا بننا چاہتے تھے ؟ ۔

'' بچپن میں ماں کہتی تھی کہ اُسکا لڑکا کلکٹر گورنر بنے گا اور ہم خیالوں میں کلکٹر گورنر بنتے رہے۔ پھر جوانی میں بہت ساری فلمیں دیکھنے کو ملیں تو ہم دلیپ کمار اور دیو آنند بننے کے خواب دیکھنے لگے اور جب ہمیں پتہ چلا کہ ہماری پڑھائی پر ماں باپ بہت خرچ کر چکے ہیں اور پیسوں کی کمی کی وجہ سے وہ آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ تو ہم نے یہ طے کرلیا کہ بی اے کے بعد اور پڑھائی نہ کرینگے بلکہ کسی بڑے سے دفتر میں چھوٹی سی کلرکی کرلیں گے اور اپنے ماں باپ کا بوجھ ہلکا کریں گے۔ اور پھر ایونگ ایم اے کریں گے۔

اسی دوران شعر شاعری کا بھی ذوق ابھرا تو کچھ لکھنے لگے۔ اس معاملہ میں بھی ہم برائے نام شاعر و ادیب رہے۔ سچ پوچھئے تو اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہم بہت جلد ہار ماننے والوں میں سے واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے ہم اپنی گریڈس، اپنی قیمت ہر لمحہ کم کرتے چلے گئے۔ ...... اور سب سے بڑا سچ تو یہ ہے کہ آج تک ہمیں پتہ نہیں لگا کہ ہم کیا بننا چاہتے تھے!

پرکاش جی آپ کی شادی لو میریج تھی یا (Arranged) ؟

''Arranged''

کیا آپ اپنے گھریلو زندگی اور اپنی بیوی سے مطمئن تھے۔ ؟

'' بھئی'' مڈل کلاس والوں کے لئے یہ کہنا مشکل ہے کے ان کی گھریلو زندگی کامیاب ہے کہ نہیں، بس اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ہم دونوں نے اپنی ڈیوٹی نبھائی ...... اب تو وہ اس دنیا میں نہیں ہے اس لئے اس بیچاری سے مجھے کوئی گلہ شکوہ نہیں ۔ ! ''

اسی سمئے باہر ایک فرّانے بھرتی ہوئی موٹر بائیک آ کر رکی۔

اور ایک نوجوان بائیک سے اترا تھا اور جو ''ہلو'' کہتے ہوئے ہال سے گزر گیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت عجلت میں ہے اور ارونا کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے اور آخر کار کچھ ہی دیر بعد وہ نوجوان ارونا کے منع کرنے کے باوجود اسے گویا گھسیٹتے ہوئے ہال سے گذر گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے موٹر بائیک دونوں کو لیکر اڑ گئی۔ ... رپورٹر کو گویا اک دھچکا سا لگا۔ کیونکہ جب سے اس نے ارونا کو دیکھا اسکے خیالات ارونا کے اردگرد گھومنے لگے تھے۔

'' یہ میرا دوسرا لڑکا سریندر ہے، یہ بینک میں ملازم ہے۔ بڑا ہی نٹ کھٹ اور تیز قسم کا انسان ہے..... ''

اپنی بھابی ارونا سے وہ بہت پیار کرتا ہے۔ اس کی بیوی ''جیا'' ڈلیوری کے لئے میکے گئی ہے۔

رپورٹر نے معمر انسان سے دوسرا سوال چھیڑ دیا۔

''سرپنشن کے علاوہ اور بھی ذرائع آمدنی آپ کے کیا ہیں ؟

''ہاں ایک چھوٹا سا پُرانا گھر جو کرایہ پر دے رکھا ہے مجھے اس سے کرایہ ملتا ہے۔ مگر ان لوگوں نے اس پرانے مکان کو توڑ کر نیا مکان بنوانے کا پلان بنالیا ہے۔ جیا کی بھی اس مکان کو تڑوانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے۔ رپورٹر صاحب تم نہیں جانتے کہ یہ پرانا پرکھوں کا گھر میرے لئے کتنا قیمتی ہے۔ یہ کسی مسجد یا مندر سے میرے

لئے کم نہیں۔

میں جانتا ہوں ۔

'' سر آپ کے مشاغل کیا ہیں ؟ یعنی Hobbies؟ ''

'' کوئی خاص نہیں۔ ویسے صبح اٹھتا ہوں اخبار دیکھ لیتا ہوں۔ ہم جیسوں کے لئے اخبار اچھا دوست ہوتا ہے کیونکہ جب گھر کے افراد اتنے بڑے ہو چکے ہوں کہ خود اپنے خیالات اور فیصلوں کو مقدم ماننے لگے ہوں تو ہمارے فیصلے، ہمارے خیالات، کو اخبار بینی کے ذریعہ ہی سے نشت کرنے کا موقع ملتا ہے کیونکہ ہم جیسے لوگ اخبارات میں یہ ٹٹولتے رہتے ہیں کہ حالات ہماری سوچ کے مطابق رونما ہو رہے ہیں کہ نہیں۔ ہاں اس کے علاوہ ایک دوسرا شوق میٹنگ اٹنڈ کرنے کا ہے۔ کبھی کچھ لکھ لیتا ہوں یا جب جب موقع ملتا ہے کھلی سڑکوں پر تنہا نکل جاتا ہوں، جب تک جی چاہے چلتا رہتا ہوں۔ اسوقت جیسے میرا رشتہ دنیا سے ٹوٹ جاتا ہے۔ میں بالکل آزاد ہو جاتا ہوں۔ آزادی کا یہ نشہ میرے وجود کو گھیر لیتا ہے اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں بس چلتا رہوں، چلتا ہی رہوں اور کبھی نچلا نہ بیٹھوں ۔ اور اس وقت تک چلتا رہوں جب تک میرے پیر جواب نہ دے جائیں۔

'' خیر آپ یہ بتایئے کہ آپ ایک (Home for the Aged) میں رہنا زیادہ پسند کرینگے یا یہیں ان گھریلو مصیبتوں کے درمیان۔''

'' بھائی ہمیں تو پتہ نہیں اور ہم سچ بولنے سے آجکل بہت گھبراتے ہیں، کیونکہ زندگی میں سچ بول کر اور سچ پر اڑے رہ کر ہم نے بہت کچھ کھو دیا ہے۔ ''

'' پھر بھی ؟ ''

''ایک طرح سے اپنوں کے درمیان رہنا اچھا لگتا ہے۔ حالانکہ اس

میں بھی بہت ساری مصیبتیں اور لعن طعن کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

دوسرے دن رپورٹر ارونا سے کچھ پوچھ تاچھ کر رہا تھا۔

'' آپ ان لوگوں کے درمیان رہنا پسند کرتی ہیں ! خصوصاً اپنے سسر کے ساتھ۔ ''

'' مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' رہنے کو گھر ہے اور کھانے پینے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ گھر کا کام کاج کرتے وقت گذر جاتا ہے۔''

'' کیا آپ سمجھتی ہیں کہ آپ کے سسر جی کو کسی Old Age Home میں داخل کر دینا چاہیئے ؟

''نہیں۔ نہیں۔ اس گھر میں کوئی ٹوکنے والا، کوئی تو اتھارٹی ہو جس کا ہونا ضروری ہے، چاہے ہم اس کی بات مانیں یا نہ مانیں۔

' آپ اُن سے بیزار نہیں ہوتیں ؟

نہیں تو.......

یہیں تک وہ پہنچے تھے کہ پرکاش کی آواز سنائی دی '' ارونا۔ ارونا۔ جلدی آنا۔ پانی ٹھنڈا ہو رہا ہے....... دیکھتی نہیں میں تیل میں لت پت ہوں....... '' آتی ہوں۔ آتی ہوں'' ! کہتے ہوئے وہ رپورٹر سے مخاطب ہوئی۔ '' آج ماما (سسر) کے (Oil Bath) لینے کا دن ہے۔ میں ابھی آئی'' کہتی ہوئی وہ اندر چلی گئی۔

معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے سسر کو بہت چاہتی ہے۔

جب وہ باہر نکلی تو ارونا کے ہاتھ میں تولیہ تھا اور وہ اپنے سسر کے سر کو پونچھنے میں مشغول دکھائی دے رہی تھی۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنے سسر کی خدمت سے بیزار

نہیں تھی۔

اب رپورٹر نے سریندر اور 'جیا' کے بارے میں اروناسے پوچھ تاچھ کی۔

رپورٹر کو پتہ چلا کہ جیا ارونا کی سگی بہن ہے لیکن وہ یہاں سب کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی۔

''کیا آپ عورتوں کی دوسری شادی کے حق میں ہیں؟ رپورٹر نے خوامخواہ ایک سوال کرلیا۔

''یہ بات تو حالات پر منحصر ہے۔ ''

آپ کو دوسری شادی کا اگر موقع ملے تو......؟

''پتہ نہیں ؟ یہ کہکر ارونا مسکرائی۔ اور کچن کی طرف لوٹ گئی۔

آج اس گھر میں سبھی موجود تھے۔ 'جیا' اپنے ننھے بچے کو لے کر واپس آچکی تھی۔

رپورٹر نے جیا کو بلوایا اور اس سے سوالات کئے جیا اس گھر میں آپ کیسے محسوس کر رہی ہیں۔ ''ٹھیک ہوں''

''کیا آپ دونوں میاں بیوی خوشحال ہیں۔ کیا آپ کے درمیان پیار و محبت ہے؟''

''ہاں...... مگر سریندر کو مجھ سے پیار ہے بھی یا نہیں میں کہہ نہیں سکتی''

وہ تیکھے انداز میں بول اٹھی۔

آپ اپنے سسر کے ساتھ رہنا پسند کرینگی یا آپ پرکاش بابو کو Old Age Home میں بھیجنا۔؟

بڈھا ہوم میں رہے یہی بہتر لگتا ہے۔

پھر رپورٹر نے سریندر سے بات کی ''بوڑھا گھر پر رہے تو چھوٹے موٹے کام ہوتے

رہیں گے''۔ اس لئے اپا کو باہر رہنے کے بجائے یہیں ہونا چاہیے۔ بہتر یہی ہوگا۔

...... اسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی ''ہلو۔ ہاں سریش جی ہاں۔ ہاں ارونا بھالی ہے نا......۔'' سریندر نے ارونا کو آواز دی ''ارونا سریش کا فون ہے''۔

''سریش بیچارہ بہت اچھا آدمی ہے۔ وہ ارونا کے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا اور ارونا کے پتی کی گریجیوٹی اور ایکسیڈنٹ کے کیس وغیرہ کا معاملہ وہی دیکھ رہا ہے'' پرکاش نے رپورٹر سے مخاطب ہوکر کہا۔

مگر رپورٹر صاحب تو کہیں اور کھوئے ہوئے تھے۔ فون پر جھکی ہوئی ارونا کو وہ بغور دیکھ رہے تھے جو رپورٹر کے دل میں اترنے لگی تھی۔

کچھ ہی دنوں بعد رپورٹر راجو، پرکاش کے دروازے پر پھر دستک دے رہا تھا۔ جیا نے دروازہ کھولا اور اُسے اندر آنے کی دعوت دی، پرکاش جیا کے بچے نجو کو گود میں لئے صوفہ پر بیٹھا تھا۔

نمستے... معاف کیجئے میں پھر یہاں آدھمکا ہوں...... کچھ پراجکٹ کے لئے اور کچھ آپ لوگوں کی محبت مجھے کھینچ لائی ہے۔

''نمستے''......

کیسا پیارا بچہ ہے، یہ آپ کا پوتا ہے نا......

''ہاں یہ نجو ہے یہ میرا پوتا۔ اپنے ناؤ پر گیا ہے، وہ بھی بڑا ہنس مکھ انسان تھا۔

''مگر راجو تمہارا آرٹکل مکمل ہوا کہ نہیں۔''

'' تقریباً ہو چکا ہے، سر '' یہ کام تو میں Free time میں کرتا ہوں ورنہ روزمرہ کا کام بھی کافی ٹائیٹ ہوتا ہے۔ اسلئے بھی مجھے قسطوں میں انٹرویو لینے پڑتے ہیں۔

آپ کے گھر کے علاوہ کچھ اور گھر بھی ہیں جہاں میں انٹرویو لے رہا ہوں.....

''ٹھیک ہے ٹھیک...... ہے۔

بوڑھا کچھ اداس نظر آرہا تھا۔

''کیا بات ہے...... کچھ پرابلم ہے، کہیں میں غلط وقت پر تو نہیں آیا ہوں۔''

نہیں تو۔ راجو صاحب...... دراصل۔ بات یہ ہے کہ......

''ارے ماما آپ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ ارونا سریش کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔'' جیا نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''جیا ایسا کیوں کہہ رہی ہو۔ سریش تو کافی اچھا آدمی ہے اور ارونا تمہاری بہن ہے اور.... وہ تو کافی عرصہ سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں...... اگر انہوں نے ایک نئی زندگی شروع......''

''ہاں۔ ہاں...... کیوں نہیں سریش کی بیوی بھی اب اس کے ساتھ نہیں ہے اور ارونا بھی بیوہ ہی ہے۔ اور دونوں جوان ہیں، ماما کہہ دو نا تمہاری لاڈلی تمہیں چھوڑ کر چلی گئی۔

''ایسی باتیں نہ کر بیوقوف لڑکی، چل تھوڑی سی چائے لا دے رپورٹر صاحب کے لئے۔'' دونوں کی گفتگو سنکر رپورٹر راجو کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ ارونا کے خیال کو اپنے دل سے نکالتے ہوئے اسے تکلیف ہو رہی تھی۔

''ماما چائے کی پتی ختم ہو چکی ہے، پاس والے دکان سے لے آنا، پتی کے بغیر چائے تھوڑی نا بنے گی ؟

پرکاش چائے کی پتی کے لئے روانہ ہو گیا......

رپورٹر نے اپنے آپ کو سنبھالا اور جیا سے اس نے دریافت کیا۔

''جیا جی، اب کیا خیال ہے اپنے ماما (پرکاش) کو ہوم فار دی ایجڈ میں داخل کروانے کے بارے میں...... میرا دوست 'پاپولر ہوم فار سینئر سٹیزن' میں منیجر ہے۔ آپ کہو تو وہاں سر جی داخل ہو سکتے ہیں۔ رقم بھی کچھ زیادہ نہیں دینی پڑیگی۔''

''ارے یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ بوڑھا میرے بچے کو سنبھالنے اور گھر کے کام کاج میں میری مدد کرتا رہتا ہے۔ تو رہنے دیجئے اس کو اور دو تین سال، تب تک سنجو بھی بڑا ہو جائیگا۔ ورنہ ہمیں ایک اور نوکرانی یا بے بی سٹر (Baby Sitter) رکھنی پڑیگی۔ اس میں کافی خرچ ہوگا۔ نا۔''

اور رپورٹر نے محسوس کیا کہ ضرورت انسان کے خیالات کو بدلا دیتی ہے۔ کل تک جو اپنے سسر کو 'ہوم' بھجوانے کی فکر میں تھی آج اسے گھر پہ رکھنے میں بھلائی سمجھ رہی ہے۔ بھئی واہ......

کتنی خود غرض تھی یہ۔ جب پرکاش سے جاتے جاتے رپورٹر نے اُس سے پوچھا کہ کیا وہ ہوم میں داخل ہونا چاہتا ہے تو اس نے ہاں کہہ دی۔ یہ جواب سنکر رپورٹر کو تعجب ہوا۔

رپورٹر اپنا آرٹیکل پورا کر چکا تھا۔ اور ایک دفعہ وہ پرکاش کو دکھانا چاہتا تھا۔ پرکاش کے گھر جب اس نے ڈائیل کیا تو پتہ چلا کہ پرکاش کو ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے اور وہ Appolo میں اڈمیٹ ہو چکا ہے۔

رپورٹر اب ہاسپٹل پہنچ چکا تھا۔ وارڈ نمبر 112 میں پرکاش پڑا تھا اور اسکے ارد گرد لوگ جمع تھے۔ نرس نے گلوکوز کی نئی بوتل رکھ کر ڈرپ کو دوبارہ چالو کر دیا تھا۔ کوئی خطرے کی بات نہیں تھی کیونکہ پرکاش کو ہوش آنے لگا تھا۔ اور وہ لوگوں کو دیکھ کر

دھیرے سے مسکرا رہا تھا۔

اس وقت وہاں بھی موجود تھے اروناؔ، سریشؔ، جیاؔ، سریندرؔ، اروناؔ کی گودی میں بچہ سنجو اور رپورٹر..... پرکاش نے اروناؔ کی طرف تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھا اور اسے پاس آنے کو کہا، اروناؔ بوڑھے پرکاش سے چمٹ کر رونے لگی اور پرکاش اپنی کمزور آواز میں اروناؔ اور سریش کا شکریہ ادا کرنے لگا تھا۔

''ماما۔ آپ ذرا بھی گھبرایئے نہیں۔ خطرہ اب ٹل گیا ہے۔ میں نے ایرکنڈیشن کمرہ کیلئے بھی رقم بھر دی ہے۔کل سے آپ کو سپشل ایرکنڈیشن کمرے میں رکھا جائیگا۔ بس ایک ہفتہ میں آپ بالکل نارمل ہو جائینگے''...... سریش بولتا چلا گیا۔ رپورٹر نے سریندر سے دریافت کر کے معلوم کر لیا کہ اروناؔ اور سریش کی بروقت مدد نے پرکاش کی جان بچائی ہے ورنہ اس ہاسپٹل کا خرچ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

جیا اب سریش اور اروناؔ کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کرتی دکھائی دینے لگی۔

''اروناؔ دیکھ تیری گودی میں کیسے چپ چاپ پڑا ہے سنجو۔'' ''سریش جی آپ یہاں بیٹھئے''۔ وہ ایک کرسی کھسکا کر کہنے لگی ''اور ہاں آپ کافی پئیں گے کہ ٹھنڈا، ابھی منگوا لیتے ہیں'' وغیرہ...... اس کے منع کرنے کے باوجود سریندر بوتل لے آیا اور زبردستی سریش اروناؔ اور رپورٹر کو ڈرینکس پینے پڑے۔

ایک اندازہ کے مطابق ہاسپٹل کے پورے اخراجات ایک لاکھ تک ہو سکتے تھے جس کی پوری ذمہ داری اروناؔ اور سریش نے لے لی تھی۔

اسپتال کی لفٹ چونکہ خراب ہو گئی تھی اس لئے سیڑھیوں کے ذریعہ راجو کو وارڈ نمبر 112 سے نیچے اترنا پڑا۔

رپورٹر راجو کے خیالوں میں ایک ہیجان تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ انسان زندگی میں خون کے رشتے بناتا رہتا ہے اور انہیں پروان چڑھاتا رہتا ہے، مگر اس کے بڑھاپے میں یہی رشتے اسے کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں اور کبھی وہ رشتے جنہیں سماج غلط سمجھتا ہے اس کی مدد کیلئے اس کی مصیبت کے وقتوں میں اس کا سہارا بن جاتے ہیں۔ رپورٹر نے محسوس کیا کہ خون کے رشتوں سے زیادہ انسانیت کے رشتوں کی سماج میں قدر ہونی چاہئے۔!

کیا سماج نے جو اچھائی، بُرائی کے معیار بنائے ہیں اسکی عمارت اب ٹوٹنے والی ہے؟

رپورٹر سیڑھیوں کے ذریعے تیزی سے نیچے اترنے لگا۔ شاید وہ یہ بھول گیا تھا کہ وہ صرف ایک رپورٹر ہے سماج سدھارک نہیں۔ !

گاؤں کی گوری

رینو بڑی ڈھن کی پکی لڑکی تھی، کہنے کو تو وہ عمر کے حساب سے اٹھارہ یا انیس کی ہوگی مگر تجربات کے جنگل میں تپ کر اس کا جسم، اسکا چہرہ اور اسکا مزاج کافی سخت ہو چکا تھا۔ اس کے چھریرے قد آور جسم سے خود اعتمادی کی لہریں پھوٹتی تھیں۔ اک آنکھیں تھیں جو اسکی کوملتا، اسکے اندر کی نرمی اور لڑکپن کا اظہار کرتی تھیں، ان آنکھوں میں بیشک جوانی کی بجلیاں تھیں جنہیں وہ اپنے پپوٹوں تلے دبائے رکھتی تھی تا کہ کسی پر ان دھڑکنوں کا اظہار نہ ہونے پائے۔

اس کی ماں گرام سیوا کا اندومتی گاؤں میں ایک مشہور اور عزت دار خاتون تھی۔ اندومتی کا پتی ایک فوجی تھا جو جنگ کے دوران مارا گیا۔ یہ اسوقت ہوا جبکہ رینو سات آٹھ سال کی ہوگی اور چھٹی کلاس میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔

رینو کو گاؤں کے کھیت نالے ہوائیں موسموں سے اتنا پیار تھا کہ وہ گاؤں سے باہر جانا پسند نہیں کرتی تھی۔ گاؤں سے ۱۰ کلومیٹر پر ہائی اسکول تھا اور رینو کو ساتویں کلاس سے دس کلاس تک پڑھنے کے لئے گاؤں سے ۱۰ کلومیٹر دور جانا پڑتا

تھا۔ ویسے بھی رینو کو زیادہ پڑھائی لکھائی میں دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے لئے کافی تھا کہ اسے تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا آ گیا تھا اور تھوڑی سی گنتی اور حساب کتاب تو وہ کرنے لائق ہی تھی۔

وہ دن بھر گاؤں کے گھروں کا چکر لگاتی تھی، شام ڈھلے پاس کے کھیتوں میں ناچتی گاتی تھی اور ندی نالوں سے کھیلتی تھی۔ جب وہ صبح صبح پانی بھرنے کے لئے پن گھٹ پر اٹھلاتی ہوئی نکل جاتی تو ایسا لگتا کہ جیسے دھان کے پودوں میں ناریل کا درخت چل رہا ہے۔ لیکن جب پانی بھر کر واپس لوٹتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ ایک بڑا خزانہ اٹھا کر لا رہی ہے۔

یہ گاؤں کی بہت اہم لڑکی تھی اور سارے گاؤں کی گوری تھی ہر تہوار، ہر شادی بیاہ کی رسم گاؤں کی گوری کی موجودگی کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی تھی، اس کی اُچھل کود اس کے بھدے قہقہے...... یہ سب گاؤں میں ہر کسی کی شادی بیاہ کا حصہ بن گئے تھے، چونکہ مکا بازی اور لٹھ چلانا بھی رینو کو کسی قدر آتا تھا اور وہ مندر کے میلوں میں اپنا یہ شوق پورا کر لیتی تھی۔ یہ نڈر اور بے باک لڑکی گاؤں سے دور پہاڑ کی طرف کبھی نکل جاتی تو ڈاکو منگل سنگھ کے لوگ اُسے پکڑ کر لیجاتے اور ایک دو دن میں واپس بھی چھوڑ جاتے۔ اس نے ایک کتا بھی پال رکھا تھا جو اس کے بھاگ دوڑ کا ساتھی تھا۔ لہلہاتے کھیتوں کے درمیان گاؤں کے ایک سرے سے دوسرے تک اپنے کتے کے ہمراہ دوڑتے پھرتے رہنا اسکا عزیز ترین مشغلہ تھا۔ مگر اس کے باپ کے مرنے کے بعد آہستہ آہستہ اس کی بے فکری دور ہونے لگی۔ جب ماں بیمار ہو گئی تو رینو کے سر بہت سارا کام کاج آن پڑا اور اٹھارہ انیس سال کی عمر ہوتے ہوتے اسکا چہرہ کرخت ہو گیا۔ اس نے کم عمری میں ہی بہت سارے فن سیکھ لئے۔ وہ چکو چلانا جانتی

تھی۔ چھڑی چلانے کا فن مکا بازی جیسے مردوں کے مشغلے بھی اسکی شخصیت کا حصہ بن چکے تھے۔ گاؤں کی یہ گوری تقریباً ۱۸ سال کی ہوگی جب ماسٹر گرو پرساد یہاں آیا تھا وہ پچیس چھبیس کا ایک خوبرو، چھریرا نوجوان تھا ہر وقت ہاتھ میں چھاتا لئے وہ گھوما کرتا تھا اور اسکی عادت یہ تھی کہ وہ ہمیشہ اپنے ناک کے سیدھے دیکھ کر باتیں کیا کرتا......

گاؤں کے کئی لڑکے رینو کی سخت جوانی کے دل ہی دل میں خواہش مند تھے۔ ایک آدھ نے بیاہ کا سندیسہ بھی بھیجا لیکن ہر مرتبہ رینو نے اسے ٹھکرا دیا تھا اس معاملہ میں وہ اپنی اماں کی بات بھی نہیں مانتی تھی کہتی تھی وہ شادی بیاہ نہیں کریگی اور اپنی زندگی گاؤں کی سیوا میں گذار دے گی۔

وہ ایک عجیب شام تھی۔ جب شام ڈھلے لسلساتے کھیتوں کو چیرتی ہوئی تالاب کی اور بھاگ رہی تھی اسوقت سورج ڈھلنے لگا تھا اور اسکی لال پیلی کرنیں کھیتوں کو گدگدا کر انہیں جھومنے پر مجبور کر رہی تھیں، بھاگتے بھاگتے جب وہ تالاب کے قریب پہنچی تھی تو کوئی چیز اسکے پیروں سے ٹکرائی تھی اور وہ دھڑام سے نیچے گر پڑی تھی۔ الغرض جب دیکھا تو اُسے پتہ چلا کہ وہ انجانے میں کسی آدمی سے ٹکرائی ہے اُسے یہ احساس نہیں رہا کہ نیچے کنارے پر نیا ماسٹر گھاس پر لیٹے آسمان کی طرف گھور رہا ہے۔

اس حادثہ پر گاؤں کی گوری نے اسے خوب ڈانٹا تھا۔ بہت برا بھلا کہا تھا۔ اس بیچارے نے تو بس چپ سادھ لی تھی۔ اسنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ لئے تھے۔ وہ اب بھی اپنی ناک کے سیدھ ہی دیکھ رہا تھا۔ کیا مجال کہ وہ اُس لڑکی کی طرف دیکھے...... کچھ دیر وہ بکتی رہی پھر ماسٹر کو اسطرح خاموش ہاتھ جوڑے کھڑا دیکھ کر چپ ہوگئی۔ کچھ دیر بعد اس کے چہرے پر ہلکی سی ہنسی آگئی تھی۔ پاس سے ایک

دھان کی پتی توڑ کر اس نے ماسٹر کو دے مارا اور پھر وہاں سے بھاگ نکلی۔ اور ماسٹر نے اس بھاگتی ہوئی لڑکی کی طرف پہلی بار نظر دوڑائی۔

اور پھر آہستہ آہستہ وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے اور کھیتوں کھلیانوں میں تالاب کے اس پار والے باغوں میں وہ ملنے لگے تھے۔ اب رینو کا کرخت چہرہ کچھ نرم پڑنے لگا تھا۔ آنکھوں میں حیا جیسی چیز نمودار ہونے لگی تھی۔ چال ڈھال میں اک لچک سی پیدا ہوگئی تھی اور بھاگم بھاگ چھوڑ کر وہ کسی قدر دھیمی ہونے لگی تھی۔

آہستہ آہستہ رینو اور ماسٹر ایک دوسرے کی محبت میں ڈوبنے لگے۔ گاؤں کی سنہری شامیں اب ان دونوں کے نام ہونے لگیں۔ گاؤں میں ان کی محبت کے چرچے ہونے لگے۔

مگر یہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے، پتہ نہیں کہ یہ کتنا قریب ہو گئے تھے اور پھر اندومتی کو دونوں کی شادی کی فکر ہونے لگی۔

ہاں اندومتی چاہتی تھی کے ان دونوں کی شادی جلد از جلد ہو جائے۔

چھٹیاں تھیں اور اس اہم دن کے لئے اپنی ماں کو گاؤں لانے کیلئے گرو وہاں سے نکلا تھا...... مگر پھر اسکا کوئی پتہ نہ چلا کہ کہاں گیا...... کیونکہ وہ کئی مہینوں کے بعد بھی واپس نہ آیا۔

انتظار کرتے کرتے، غم اور شرمندگی سہتے سہتے، اندومتی چل بسی اور..... دس بارہ سال یوں ہی بیت گئے۔

رینو آج بھی اسی گاؤں میں ہے وہ تیس بتیس سال کی ہو چکی ہے، وہ پھر سے گاؤں کی گوری بن چکی ہے۔ گاؤں کے ہر تہوار ہر شادی بیاہ، ہر رسم میں اسکی

بھاگ دوڑ پھر سے شروع ہوگئی ہے اس کا چہرہ پھر سے کرخت ہوگیا ہے وہ پھر سے پاس کے گاؤں کے غنڈوں سے لڑ بھڑ جاتی ہے۔

اس کے باوجود اسکی آنکھوں میں ایک قسم کے غم کے نشان برابر دیکھے جاسکتے ہیں۔ اور ہر شام وہ برابر شہر جانے والی سڑک پر ایک کونے میں بیٹھی دیکھی جاسکتی ہے..... کسی کے انتظار میں۔ اسے یقین تھا کہ گرو آئیگا...... اکیلا نہ سہی اپنی بیوی کے ساتھ ہی سہی۔ وہ آئے گا......

اور بیشک گرو لوٹ کر آیا تھا۔ اپنی بیوی اور ایک بچی کے ساتھ......، اسکول کا ہڈ ماسٹر بن کر۔

رینو، گرو اور اسکی بیوی کو دیکھ کر پھولے نہ سمائی اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے اس نے گرو کی بیوی کو گلے سے لگایا......

'' یہ گاؤں آپ لوگوں کا انتظار کر رہا تھا اس گاؤں کو تعلیم کی سخت ضرورت ہے، بے حد ضرورت ہے، ہاں اور دوسری کسی چیز کی بھی نہیں...... ''
اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ جیسے کہہ رہی ہو میری بھی ضرورت نہیں۔

دوسرے دن گاؤں کے تالاب میں رینو کی لاش ملی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گاؤں کی گوری گاؤں والوں کو چھوڑ کر ہمیشہ کیلئے چلی گئی ہے۔

شمشان گھاٹ پر بہت سارے لوگ جمع تھے۔ اس گاؤں کے لوگوں کے علاوہ آس پاس کے قریوں سے بھی لوگ آئے ہوئے تھے۔ رینو کی لاش جب چتا پر رکھی گئی لوگوں کے دل دہل گئے کیونکہ وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ کوئی سختی اور کرختی اس کے چہرہ پر نہیں تھی۔

ماسٹر گرو پرساد سے کہا گیا کہ وہ چتا کو آگ لگائے۔ کیونکہ اب اس

دنیا میں رینو کا کوئی نہیں تھا۔

آگ رینو کو جلانے لگی اور غم سے بھرے ہوئے یہ لوگ آنسو بہاتے شمشان گھاٹ سے میدان کی طرف نکل گئے۔

گاؤں کا مکھیا روتے جا رہا تھا اور بولتے جا رہا تھا ''تمہیں معلوم ہے اس گاؤں میں کئی سالوں سے ایک ریت چلی آئی ہے۔ کوئی نہ کوئی ایسی لڑکی پیدا ہوتی ہے جو اس گاؤں کی گوری کہلاتی ہے۔ رینو سے پہلے اس کی ماں تھی جو اس گاؤں کی گوری تھی اس سے پہلے شاردا تھی جو مندر کے پجاری کی لڑکی تھی...... پتہ نہیں اس گاؤں کا اب کیا ہوگا پتہ نہیں اب کوئی گاؤں کی گوری آئیگی کہ نہیں...... اس اثنا میں پاس کھڑی ہوئی ماسٹر کی بیوی کی زبان سے جانے کیوں نکل گیا ''کاکا...... تم فکر نہ کرنا، یہ میری بچی شالو آپ کے گاؤں کی گوری بنے گی...... جبکہ ہم اس کو پڑھنا لکھنا سکھائیںگے تم اسے وہ تمام چیزیں سکھانا جو اس گاؤں کی گوری کو کرنا پڑتا ہے...... ''

مکھیا نے اپنے آنسو پونچھ کر بچی شالو کے سر پر ہاتھ رکھدیا۔ ادھر رینو کے کتے نے شالو کے آس پاس گھومنا شروع کردیا...... اور جب یہ لوگ اپنے گھر واپس لوٹنے لگے، رینو کا کتا شالو کے پیچھے دُم ہلاتا پیار سے اُچھلتا کودتا چلے جا رہا تھا...... بھوں بھوں... بھوں بھوں، اور اسکی یہ آواز دور تک گاؤں میں سنائی دینے لگی۔

پکارتے رہو

سال نو کی آمد آمد تھی۔

مدراس میں سال نو کی آمد پر ایک صنعتی نمائش لگتی ہے۔ اور اک میلہ بھی ہے، جو تقریباً تین مہینوں تک جاری رہتا ہے۔ آئی لینڈ گراؤنڈس کا آخری حصہ جہاں کووم ندی دو میدانوں کو علیحدہ کرتی ہے، وہاں کافی ہریالی ہوتی ہے اور کافی ٹیلے، انہیں کے بیچ یہ نمائش گاہ خیموں کو نصب کر کے بنائی جاتی ہے، اسی کے سامنے کچھ دور اتھاہ نیلا سمندر اٹھلاتا دکھلائی دیتا ہے۔

شمال کی جانب فورٹ سینٹ جارج ہے جو برطانیہ طاقت کا ایک بولتا نشان ہے۔ جنوب میں شہر کی مشہور سڑک مونٹ روڈ نکل گئی ہے، جسے آج کل انا سالئے کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

سنیچر اور اتوار کے دن تو خاندان کے خاندان نمائش گاہ پر اُمڈ پڑتے ہیں۔

آج بڑا سوکھا دن تھا اور اکیلی جان سیشن کتابیں پڑھ پڑھ کر بور ہو چکا تھا۔

مارچ میں خاصی گرمیاں یہاں شروع ہو جایا کرتی ہیں، اور تقریباً چار

بجے شام سیشن نے نمائش گاہ (اگزیبیشن) جانے کا فیصلہ کر ہی لیا.......

ٹکٹ خرید کر اندر داخل ہوتے ہوتے تو وہ پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔

وہ تھوڑی سی گرمی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا اور تناؤ کا شکار ہو جاتا تھا۔

اب گویا وہ اپنے آپ کو اس میدان میں گھسیٹے جا رہا تھا کہ مائک پر آواز آئی

Calling Mrs. David, Calling Mrs. David,

Your husband is waiting for you.

وہ اس بھیڑ بھاڑ سے کافی پریشان تھا۔

میدان میں دھول اڑ رہی تھی۔ جیسے انگیٹھی سے لوبان کا دھواں اٹھ رہا ہو۔ سیشن پاس کے ایک اسٹال میں گھس گیا۔ یہ اسٹال کسی پبلیشر نے رکھی تھی۔ اسٹال میں قرینے سے رکھی ہوئی کتابیں اسے دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں۔ اسے رنگین ناکلوں والی کتابیں بہت بھاتی تھیں۔ اسٹال میں وہ کافی دیر کتابوں کو الٹ پلٹ کرتا رہا۔ اس اثناء میں وہ اپنے اندر عجیب سی طمانیت محسوس کرنے لگا تھا۔

وہ اسٹال سے ابھی باہر ہی نکلا تھا کہ پھر اس کے کانوں میں وہی آواز آئی۔

Calling Mrs. David, Calling Mrs. David.

وہ اب ریلوے والے اسٹال میں گھس چکا تھا۔

مدراس شہر کو احاطہ کئے ہوئے دوڑنے والی نئی ریلوے لائن کا پورا نقشہ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا۔

میلاپور سے اپنے دفتر آنے میں اسے اب کافی آسانی ہوگی۔ اس اسٹال میں خیمہ کے اندر ایک پرانی ڈیزل انجن کھڑی کر دی گئی تھی۔ بچے اس کے اوپر نیچے ہو رہے تھے اور خوب انجائے کر رہے تھے۔

کاش وہ بھی بچہ ہوتا تو اس انجن کے نیچے اوپر چڑھ کر اپنا من بہلاتا اور اتنا بور نہ ہوتا۔

شام کی دھوپ کافی تیز تھی۔

میدان میں لوگوں کے آنے سے گرد اور شور بہت بڑھ گیا تھا۔ اپنا حلق اور مزاج ٹھیک کرنے کے لئے وہ کینٹین میں گھس گیا۔

کینٹین کھچا کھچ بھرا تھا۔ بمشکل اسے ایک خالی کرسی دکھائی دی اور سیشن اس کرسی کی طرف بڑھ گیا۔

اب جس کرسی پر وہ بیٹھا ہوا تھا اس کے برابر بازو والی ایک کرسی پر ایک حسین عورت کو دیکھ کر پہلے تو وہ نروس ہوا، لیکن خواہی نخواہی اپنا مزاج بحال کرنے کے لئے اسے اس کرسی پر بیٹھنا ہی پڑا۔ پھر بھی وہ اپنے آپ پر قابو پا نہ سکا۔ اس لئے اس نے جلدی سے ٹھنڈی بوتل منگوائی اور حلق گیلا کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ نمائش کے دفتر سے مائیک پر پھر وہی آواز سنائی دینے لگی:

Mrs. David, Your husband is waiting, Please come to the office.

''مسز ڈیوڈ یور ہزبینڈ از واٹنگ۔ پلیز کم ٹو دا آفس''

پتہ نہیں کیوں اس نے اس آواز کے پیچھے معنی و مطالب کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ ایسا کرتے وقت لامحالہ اس کی نگاہ بازو بیٹھی ہوئی اس حسینہ کی طرف مڑ گئی، جو اس کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔ سیشن اس کی تیز نگاہی برداشت نہیں کر سکا۔ اس نے ٹھنڈی بوتل جھٹ سے لی اور ڈرنک کو اپنے حلق میں انڈیل کر ہی اس نے اطمینان کی سانس لی اور کینٹین سے باہر نکل کر واٹر ورکس کے اسٹال کی طرف بڑھ گیا۔ مگر وہ آگے ہی بڑھنا چاہتا تھا کہ سیشن کو کسی نے پیچھے سے آواز دی۔

''ہیلو''....... یہ میٹھی سی پیاری سی ''ہیلو'' کہنے والی آواز کی طرف جب وہ مڑا تو اسے وہی حسینہ نظر آئی جو اس کے ساتھ کینٹین میں دکھائی دی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اسے محسوس ہوا جیسے یہ آواز جتنی اجنبی ہے اتنی جانی پہچانی بھی ہے اور اسے یہ حسینہ پہلے کبھی ملی ملی سی دکھائی دینے لگی۔

سیشن کو بڑی گھبراہٹ ہوئی۔

شام ابھی گرم ہی تھی۔ خیموں، اسٹالس اور دکانوں کے درمیان چلنے والوں کی بھیڑ لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہی تھی۔

مائیک سے بولنے والے نے پھر دہرانا شروع کیا:

Calling Mrs. David, Mrs. David, Please come to Exhibiton Office.

''مسز ڈیوڈ براہ کرم نمائش کے دفتر آئیں۔ مسٹر ڈیوڈ آپ کا انتظار کر رہے ہیں''۔

ویسے بھی وہ بھیڑ بھاڑ اور دھوپ سے بہت تنگ آ چکا تھا۔ اس پر ایک نوجوان حسینہ کا اس کے قریب کھڑے کھڑے اس کی طرف دیکھ کر مسکرانا اس کے لئے گویا جان لیوا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے محسوس کیا وہ شرم سے زمین میں دھنسنے لگا ہے۔ پھر بھی بڑی ہمت کر کے اس نے پوچھ ہی لیا۔

''میڈم آپ کے لئے میں کیا کر سکتا ہوں''

''آپ کو تکلیف تو ہوگی مگر کیا آپ مجھے اکزیبشن کے دفتر تک پہنچا سکیں گے؟''

وہ کچھ کہہ نہ سکا۔

پاس سے دو تین کانسٹیبل گذر رہے تھے۔ سیشن نے ان کی طرف دیکھ کر حسینہ سے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ اس سے پہلے وہ کچھ کہے اس عورت نے سیشن کے

ہاتھ میں اپنا ہاتھ پھنسا کر اسے آگے لے جانا شروع کیا۔

وہ سوچتا رہا کہ حسینہ اس کانسٹیبل کے ساتھ دفتر کا رخ کرے گی اور وہ بال بال بچ جائے گا۔ مگر وہ تو جیسے اس سے چپک پڑی تھی۔

''دیکھئے چلتے چلتے ڈاگ شو (Dog Show) دیکھ کر چلتے ہیں۔''

وہ تو اسے گھسیٹ کر لے جانے لگی تھی، لڑکی کا ہاتھ لگتے ہی گویا اس کے اندر ہزاروں واٹ والی برقی رو سرایت کرنے لگی اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ ڈاگ شو والی ٹینٹ میں داخل ہو چکے تھے۔

سیشن کو اس حسینہ نے بڑی عجیب کشمکش میں ڈال دیا تھا۔ یہ عورت خواہ مخواہ اس کے گلے پڑ رہی تھی۔ پر وہ اپنے آپ کو اس کے آگے بڑا بے بس محسوس کر رہا تھا۔ مگر شاید دل کے کسی کونے میں اک سرور سا محسوس ہونے لگا تھا اسے۔

کتوں میں بلا کا انٹیوشن ہوتا ہے، وہ کسی کو سونگھ کر ہی اس کے متعلق کئی باتیں بتا سکتے ہیں۔ یہ کہ وہ دوست ہے کہ دوست نہیں ہے۔ یہ کہ آیا کوئی خوبصورت ہے کہ نہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس ڈاگ شو میں کتوں اور کتیوں نے کئی کرتب دکھائے۔ ڈانس کیا۔ ایکروبیٹکس کئے اور پھر اپنے ماسٹر کے سوالات کے جوابات بھی دئے۔

ماسٹر نے جب یہ سوال ایک کتیا سے کیا کہ اس وقت وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سب سے خوبصورت لیڈی کون ہے؟ تو کتیا فوراً اس حسینہ کے گود میں آکر بیٹھ گئی جو سیشن کے ساتھ گھوم رہی تھی۔

سیشن نے اب تک اس حسینہ کو خاص نظر سے دیکھا نہیں تھا۔

جب کتیا نے اس عورت کی گود میں بیٹھنا پسند کیا تو سیشن کی نظریں اس طرف ہو گئیں۔

عورت واقعی بہت حسین تھی۔ عمر تقریباً پینتیس یا چھتیس کی ہوگی۔ میانہ قد، سڈول جسم، بال کالے گھنے، چہرہ شفاف، ہونٹ رسیلے بس ایسی لیڈی کہ جو اسے دیکھے اس کا جی للچائے۔

ایک دوسرے سوال پر کہ ''ڈارلنگ یہ بتانا کہ آج کونسی عورت بغیر نہائے یہاں آئی ہوئی ہے؟''

کتیا پھر ادھر آئی اور اس حسینہ کے آگے پیچھے منڈلانے لگی۔

''ہاؤ ناٹی۔ کہتے ہوئے عورت نے اس کتیا کو گود میں اٹھا لیا اور کتیا کو پیار سے چوم لیا اور لوگ تالی بجا کر اس کی تعریف کرنے لگے۔ باہر پھر وہی آواز آ رہی تھی۔

Calling Mrs. David, Please Mrs. David come to Office.

جب وہ باہر نکلے تو سیشن پھر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

اوہ بابو میرے بارے میں آپ کیا سوچ رہے ہیں؟.........

ارے بھائی میں ہی ہوں مسز ڈیوڈ اور مجھے ہی بلایا جا رہا ہے۔ سمجھے جناب۔''

اور....... میں چلی جاؤں گی۔ آپ گھبرائیں نہیں....... مسٹر مسٹر.......

''سیشن ہوں''

''تو ہاں مسٹر سیشن....... یہ کہتے ہوئے مسز ڈیوڈ سیشن کو ایک اور کتابوں والی اسٹال میں لے گئی۔ ''یہ دیکھئے....... کیسی کیسی کتابیں ہیں یہاں۔ سچ پوچھئے تو یہ ایک چھپا ہوا خزانہ ہے۔'' اس عورت پر ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی تھی اور وہ ادھر اُدھر اسٹال میں گھومنے لگی تھی۔

سیشن خود بھی کتابوں کا دلدادہ تھا۔ رنگین ٹائٹلوں والی چکنی چکنی کتابیں دیکھ کر وہ بہت ہی محظوظ ہونے لگا۔ اس کا تو جی چاہ رہا تھا کہ چپکے سے بغل میں کتابیں دبا کر نکل جائے۔ پہلے بھی ایک دو دفعہ وہ یہاں آیا تھا۔ لیکن کسی حسین عورت کے ساتھ پھنستے پھنساتے ریکس کے درمیان گزرنا گھومنا جب کہ اس عورت کی کھسر پھسر برابر جاری ہو اس کے لئے بڑے ہی عجیب کیفیات کا حامل تھا۔

مسز ڈیوڈ نے ریکس سے جنوبی امریکہ کے ایک قلم کار البیر کاموکا ایک انگریزی ترجمہ شدہ ناول ''دی اسٹرینجر'' نکالا۔

''ارے بھئی اس قلم کار کو پڑھو، تمہیں پتہ چلے گا کہ اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ ہم کسی خاص مقصد کے بناء ہی اپنی اپنی طبعی زندگی گذار رہے ہیں۔ اس کرۂ ارض میں حقیقتاً کوئی آرڈر، کوئی سسٹم دائمی ہے، ایسا پتہ نہیں چلتا اور اسی طرح انسان کی تہذیبی زندگی میں اقدار کا سسٹم بھی ضروری نہیں کہ وہ دائمی ہو اور مجھ سے پوچھو تو میں یہی کہوں گی کہ اخلاق، وفاداری، یہ سب نسبتی باتیں ہیں۔ سچ پوچھو تو انسان کا احساس ہی سب سے بڑا سچ ہے'' قدرے قریب ہو کر مسز ڈیوڈ نے سیشن سے کہا۔

O, man! life is just a feeling, and feeling is life.

پھر ہاتھ بڑھا کر اس ریکس سے اور ایک کتاب نکالی۔ ''یہ ہے Ishiguru.... اور زیادہ وہ سیشن سے چپک گئی۔

''نہیں...... نہیں...... اب چلو یہاں سے''۔ سیشن بمشکل اس سے اپنا ہاتھ چھڑا کر باہر نکلنے میں کامیاب ہوا اور مسز ڈیوڈ کا ہلکہ قہقہہ فضا میں گونج گیا۔

باہر آسمان پر بادل کے ٹکڑے نظر آ رہے تھے۔ سمندر سے چلنے والی نرم ہواؤں نے گرمی کی شدت کو کم کر دیا۔ میدان بھیڑ کے باوجود فرحت بخش نظر آنے لگا تھا۔

Calling Mrs. David.

پھر وہی آواز میدان میں آ رہی تھی۔

''تم راستہ کیسے بھول گئیں''۔

''میں نہیں، وہ گم ہو گئے تھے۔ پہلے بھی ایک دو دفعہ جب ہم یہاں آئے تھے وہ راستہ ہی میں کہیں کھو گئے تھے اور اکوِیشن آفس سے اسی طرح مجھے پکارا گیا تھا۔ پہلی دفعہ فوراً ہی پوچھ پچھار کر ان سے جا ملی تھی اور دوسری دفعہ بھی...... پر اب مجھے بھی گم ہو جانا اچھا لگتا ہے اور کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ انسان اپنے خود، کو اٹھائے اٹھائے پھر رہا ہے اور چاہ رہا ہے کہ کب اسے موقعہ ملے کہ وہ اس کے خود کو نیچے اتار پھینک کسی بھیڑ میں یا کسی حدوں کو چیرتی ہوئی کھلی فضا میں اپنے آپ کو پھیلا دے۔

اب آپ ہی کو لیجئے جناب! آپ کتنے گم صم، تنہا اس بھیڑ میں چلے جا رہے تھے اور اندر ہی اندر یہ چاہ رہے تھے کہ کم از کم اس بھیڑ میں آپ گم ہو جائیں تا کہ اپنی شناخت اور اپنی خودی سے آپ کو چھٹکارا ملے۔ اگر آپ شادی شدہ ہیں، آپ اپنی بیوی کو ساتھ نہیں لائے ہیں تو ضرور آپ اپنے رشتوں سے دوری اختیار کرنا چاہ رہے ہیں۔ اگر آپ نے اب تک شادی نہیں کی ہے تو آپ اور زیادہ گم گشتہ فضائے لامکانی ہیں کیونکہ آپ کو رشتوں سے ڈر لگتا ہے......'' اور اس طرح وہ بولے جا رہی تھی اور زبان بڑی تیز چل رہی تھی اس کی۔ اتنی تیز کہ جیسے کسی ڈھلوان

سے گزرنے والے ریل گاڑی کا بریک فیل ہوگیا ہو۔

''اور اگر آپ شادی شدہ تھے اور اب اس دُنیا میں آپ کی بیوی نہیں ہے یا اگر بیوی میکے گئی ہے تو بتائے اب تک مجھ جیسی لڑکی کے ساتھ رہ کر جناب والا کا ذہنی طور پر مجھ سے دور رہنا کیا ظاہر کرتا ہے۔ یہی نا آپ رشتوں سے گھبرا رہے ہیں اور اپنے آپ سے بھی گھبرا رہے ہیں۔ حالانکہ اس جگہ اکیلے گم صم گھومنے کا مطلب ہی یہی ہے کہ آپ انجانی بھیڑ میں بے نام، بے رشتہ گم ہو جانا چاہتے ہیں....... اور جناب آپ کو ایک اور بات پتہ کی بتادوں وہ یہ کہ عورتوں سے زیادہ مرد ہی اپنے آپ کو کھو دینا چاہتے ہیں تعلقات رشتے پرابلم اور اپنی خودی کو پھینک کر کسی ایسی دُنیا میں جو انہیں ایک نئی آزادی کا احساس دلائے اور اپنی شناخت کا ایک نیا باب انہیں نصیب ہو۔

''تم کیسی عورت ہو''۔ وہ آخر جھنجھلا کر پوچھ بیٹھا۔

''میں صرف عورت ہوں....... عورت ایسی ویسی اچھی بری سب تو آپ لوگ بنا دیتے ہیں، ہم عورتوں کو!'' اور پھر وہ زور زور سے ہنسنے لگی....... سیشن کو تھوڑی دیر کے لئے اس کی ساری باتیں سچ معلوم ہونے لگیں۔ اس کی بیوی کو میکے گئے ہوئے چھ سات مہینے ہو چکے تھے اور وہ اب تک بلانے کے لئے ٹال مٹول کر رہا تھا۔

کالنگ مسز ڈیوڈ کی آواز برابر کانوں میں گونج رہی تھی۔ پر ان دونوں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

شام بہت ہی خوبصورت ہو چلی تھی اور ''جیانٹ وھیل'' کی طرف اب وہ بڑھ گئے تھے۔

مسز ڈیوڈ نے ہی ٹکٹیں خریدیں اور اب وہ دونوں جیانٹ وھیل میں بیٹھے تھے۔ ان کے بازو ایک اینگلو انڈین بڑھیا ڈری سہمی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس ہنڈولہ میں چونکہ تین لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی، اس بڑھیا اینگلو انڈین کو ساتھ لینا ہی پڑا ورنہ ان دونوں کا تو جی چاہ رہا تھا کہ ان کو پریشان کرنے والی کوئی چیز درمیان نہ ہو۔

ہنڈولے اُوپر کی طرف اٹھنے لگے۔

وھیل چالو ہوگئی، لوگ اوپر جانے لگے، عورتوں اور بچوں کی ہلکی چیخیں نکلتی سنائی دینے لگیں۔

''دو تین دفعہ ہی وھیل گھومی ہوگی کہ اینگلو انڈین عورت مسز ڈیوڈ کے تقریباً گود میں لڑھک گئی اور اس سے گویا بچنے کے لئے مسز ڈیوڈ کو سیشن کے پہلو میں گھس جانا ہی پڑا۔

وہ زمین سے بے تعلق اوپر جب اٹھنے لگتے ایک عجیب سا احساس اُن کے اندر پیدا ہو جاتا....... لطیف ہونے کا احساس، آزادی کی گدگدی کا احساس، ایسا احساس جو نئی نویلی دُلہن کے پہلے بوسے سے جھنجھناہٹ پیدا کر دیتا ہے۔

وھیل گھومتی رہی، ہنڈولے اوپر نیچے ہوتے رہے اور مسز ڈیوڈ سیشن کے پہلو میں گھستی رہی۔ سیشن کو مجبوراً اسے ہاتھوں سے تھامنا پڑ رہا تھا۔ کئی دفعہ اس حسینہ کے نرم نرم ہلکے گلابی رخسار سیشن کی صورت سے مس ہوتے رہے۔ سیشن کے اندر ایک ہیجان پیدا ہوگیا تھا اور تمام رکاوٹیں دور ہوتی گئیں۔ ان کے ہاتھ ایک دوسرے کو چھونے لگے۔ ان کے احساس بلندیوں میں ناچنے لگے، ان کے ہونٹ کانپنے لگے اور فرطِ مسرت سے حسینہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں....... اور سیشن تاب نہ لا سکا۔ اس نے جلدی سے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر ثبت کر دئیے یکا یک وھیل ٹھہر

گئی تھی اور ان کے ہنڈولے اوپر ہی اٹک گئے تھے۔ شاید کوئی میکانیکل پرابلم تھا۔

اوپر سے ان کی داہنی جانب وشال سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا صاف نظر آرہا تھا۔ بائیں اور کچھ دوری پر ریلوے اسٹیشن اور ان کی مقابل فورٹ سینٹ جارج کا قلعہ نظر آرہا تھا۔ وہ گویا آسمان پر تھے۔ زمین ان کے پیروں تلے تھی۔

ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے زمین کے قوانین کا کوئی ان پر اثر نہیں ہوتا تھا۔ اس قدر اونچائی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، بڑھتی ہوئی شام اور چپکی ہوئی حسینہ ایک پہلو میں، سیشن کے جسم میں گدگدیاں بھر گئیں۔ اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی شمعون"Samson" ہو اور اپنی بیڑیاں خداداد طاقت سے توڑ کر باہر نکل آیا ہو۔

پھر انہوں نے ایک دوسرے کو بہت چھوا، بہت دیکھا اور ایک دوسرے سے بہت چپکا کئے اور اتنے مست ہوئے کہ ہر طرف انہیں خوشبوؤں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

پر ہنڈولے پھر نیچے کی طرف اترنے لگے۔ آسمان سے پھر وہ زمین پر آگئے تھے اور پھر وہی آواز انہیں سنائی دینے لگی۔

''کالنگ مسز ڈیوڈ.......

شام رات میں تبدیل ہونے لگی تھی اور وہ دونوں ناگ وناگن کی سی مستیاں بکھیرتے خیموں اور دکانوں کی قطاروں کے پیچھے اندھیرے راستوں سے گذر رہے تھے۔ جب کہ پکے راستوں میں بجلی کی روشنی ہو چکی تھی۔ اندھیروں سے نکل کر پکے راستوں پر آنے کا ان کا جی نہیں کر رہا تھا۔

اب وہ کنٹرول روم کے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ جہاں مسٹر ڈیوڈ اپنی بیوی کے انتظار میں بیٹھے ہوں گے۔

''کالنگ مسز ڈیوڈ، مسز ڈیوڈ آپ فوراً آجایئے دفتر۔ کنٹرول روم، میں آپ کے شوہر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔

اکزیبیشن کے دفتر میں ہی کنٹرول روم تھا اور وہیں سے مائیک پر آواز دی جا رہی تھی۔

''اب مجھے جانا ہی ہوگا مسٹر سیشن۔'' اب اس پکار سے بچنا ممکن نہیں۔

اس نے جاتے جاتے سیشن کو ایک زوردار بوسہ عطا کیا اور وہ یہ جا وہ جا ہوگئی۔

''پر بتاؤ پھر کب ملاقات ہوگی؟'' وہ پلٹ کر مسکرائی پھر کہا ''تمام ملاقاتیں جاری ہی نہیں رہتیں۔ تمام کہانیاں انجام تک نہیں پہنچتیں مسٹر سیشن۔ کئی کہانیوں میں نقطۂ عروج اور نقطۂ زوال نہیں ہوتا۔ زندگی کی کہانیوں میں ایک ہی مقام پر شروعات اور اختتام بھی ہو جایا کرتا ہے ......'' اور کچے رنگ کی طرح وہ اڑ گئی۔ اجالوں کی طرف، رشتے ناتوں کی دُنیا میں، پر سیشن ابھی کھڑا تھا۔ اندھیروں میں اور اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہاں سے ہلے کیونکہ وہاں ابھی اس حسینہ کی خوشبو باقی تھی۔ اچھوتے انہونی لمحے اسے گھیرے ہوئے تھے۔ ان لمحوں کو وہ کھونا نہیں چاہتا تھا، جس میں اس کی شناخت کا ایک نیا انداز ابھر آیا تھا۔ شاید وہ یونہی کھڑا رہتا اگر اس کا دوست اسے آکر چونکا نہ دیتا۔

''ہلو سیشن۔ تم اس طرح اندھیرے میں کیا کر رہے ہو۔ چلی گئی نا وہ تو''۔

''ہوں...... مگر تم''

میں تو کب سے تم دونوں کو گھومتے دیکھ رہا تھا اور تم ہو کہ

.... میری طرف تمہارا دھیان ہی نہیں گیا۔ حالانکہ میں تمہارے قریب سے کئی دفعہ گذر چکا تھا۔

''ایسا ہے کیا''

تم تو مس نرملا میں کھو چکے تھے۔ وہ ہے ہی ایسی۔

مس نرملا....... نہیں وہ تو مسز ڈیوڈ

''مسز ڈیوڈ نہیں وہ تو مس نرملا ہی ہے....... ایک ٹورسٹ گائیڈ جسے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ بڑی مزیدار چیز ہے وہ۔''

''مس نرملا ٹورسٹ گائیڈ''۔ سیشن کی آواز حلق میں ہی اٹک گئی۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو رمیش، اس نے تو کہا تھا وہ مسز ڈیوڈ ہے اور اس کے لئے مائیک پر کال ہو رہا تھا۔''

نہیں سیشن وہ تو ایسی ہی ہے بڑی نٹ کھٹ، اچھے اچھوں کو چکمہ دے جاتی ہے۔

ان کی یہ گفتگو جاری تھی اور وہ روشنیوں میں آ چکے تھے اور یہ روشنیوں والا راستہ انہیں شہر کی طرف لے جا رہا تھا، جہاں بنے بنائے رشتے اور کھوکھلے جذبات کی دنیا روشن ہے۔

بلی گاؤں

آج سے چند سال پہلے کی بات ہے میں تب اسکول سے فارغ ہو چکا تھا اور کالج میں داخلہ کے لئے کوشاں تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں ابھی باقی تھیں۔ اور ہمیں خوب مزے کرنے تھے۔ چھٹیاں گذارنے کے لئے کہیں تو ہمیں جانا تھا اور ہم گئے بھی تو کہاں، ایک چھوٹے سے گاؤں پرنام بٹ میں۔

پرنام بٹ میرا گاؤں نہیں تھا، میری ایک رشتہ دار نانی وہاں رہتی تھی۔ اس وقت اس بستی کے آس پاس کھیت ہی کھیت تھے اور کچھ فاصلے پر پہاڑ ہی پہاڑ....... مسلمان کافی تعداد میں یہاں بستے تھے۔ کہتے ہیں کہ نوابوں کی حکومت کے زمانے میں اس گاؤں کا نام پیاری پیٹ تھا جو اب بگڑ کر پرنام بٹ ہو گیا ہے۔ یہاں کھانا، پینا سب مفت ہونے کے علاوہ پوری بے فکری اور آزادی تھی۔

اس وقت نہ گرمیوں میں اتنی شدت تھی نہ سردیوں میں اتنا کڑاکا۔ اسوقت گلی میں برقی چراغ کم کم نظر آتے تھے اور گھروں میں رات گئے مٹی کے تیل کے چراغ ہی جلتے تھے۔ چھوٹی گلیاں تھیں اور ان کے درمیان ایک شاہراہ تھی جو ابھی تک

ویسی کی ویسی ہے۔ ان سڑکوں گلیوں میں جب بھی ہلکی بارش ہوتی تھی تو اک نیالی خوشبوز مین سے اٹھنے لگتی تھی۔

پتہ نہیں کیوں ہمیں اس دفعہ پرنام بٹ میں بڑا مزہ آرہا تھا؟ کئی پرانے دوست اور رشتہ دار یہاں جمع ہوکر خوب موج مستی کرنے لگے تھے۔

پرنام پیٹ ٹاؤن سے کچھ فاصلہ پر ایک علاقہ بنگلا میڈو ہے۔ جہاں سے دو پہاڑ نظر آتے ہیں۔ ان پہاڑوں کے قریب لوگ جانے کے لئے منع کرتے تھے۔ لوگوں کا کہنا تھا پہاڑوں کے اس پر بلی گاؤں ہے، جہاں خوبصورت بلائیں رہتی ہیں جو مردوں کو پکڑ لیتی ہیں۔ ایک بار جو ادھر گیا وہ واپس نہیں آتا تھا۔

مگر ہمیں اس وقت دنیا میں بڑے بڑے کام کرنے کا اور نئی چیزیں تلاش کرنے کا سر میں سودا سمایا تھا۔ ایک وسیع وعریض دنیا ہمارے سامنے تھی، ایک لمبی سی عمر اور ایک کھلی بے فکری، ایسے لگتا تھا جیسے ہمارے ہاتھوں میں کسی نے رام بان (رام کا تیر) تھما دیا ہو اور ہمیں کسی سیتا کو جیت کر لانا ہے، یا یہ کہ ہم یوسف ثانی ہیں اور مصر کے بازار سے شاہانہ انداز میں گذر رہے ہیں اور کئی حسیناؤں کی انگلیاں ہمیں کٹوائی ہیں۔ ایک سرفروشی تھی ذہن میں اور کچھ کر گذرنے کی اُمنگ نس نس میں بسی ہوئی تھی۔

......اور ایک دن بنگلا میڈو کے پہاڑ کے قریب اپنے ایک دوست باہجان کے ہمراہ ہم چلے ہی گئے۔ اس وقت دو پہر تھی، ابھی شام نہیں ہوئی تھی۔

ہم چلتے گئے چلتے ہی گئے . . . . . بہت دُور . . . . . ہمیں پتہ نہ چلا کہ ہم کہاں اور کیوں جا رہے ہیں۔

ہم ان تتلیوں کی طرح جو دیوانہ وار ایک پھول سے دوسرے پھول کی

طرف دوڑتی ہیں، ایک جگہ سے دوسری جگہ بڑھتے چلتے گئے۔ ایک پرانی سڑک اور پہاڑ کے درمیان ایک میدان کے بیچ ایک پُرانی درگاہ تھی۔ کہتے ہیں کہ اس صاحب مزار سے بڑی بڑی کرامتیں ظہور پذیر ہوئی تھیں۔ اسی درگاہ کے پاس ایک چھوٹا سا جھونپڑا تھا۔ اس جھوپڑے میں ''پیلے بابا'' رہتے تھے۔ پیلے اس لئے کہ ان کے کپڑے گیروی ہوتے تھے اور سر پر دستی بھی پیلی ہوا کرتی تھی، لمبے لمبے بال تھے ان کے۔ بڑے مجیم شحیم تھے وہ!

''بچو کہاں بھٹک رہے ہو، کہاں جانا ہے تمہیں'' بابا کی گہری آواز ہمیں سنائی دی۔ ہم نے جھٹ سے کہہ دیا کہ ہمیں درگاہ شریف جانا ہے۔ تو انہوں نے پاس بلا کر اپنی ''مور پنکھ'' والی کچھی ہمارے سر پر رکھی اور کہا کہ ہم وہاں سے جلدی واپس چلے جائیں ورنہ شام ہوتے ہوتے اُس علاقے میں عجیب آوازیں اور ڈراونی پکاریں سنی پڑیں گی۔

مزار کے اطراف کافی جگہ تھی، جس میں آم اور ناریل کے درخت دکھائی دے رہے تھے۔ مزار کے قریب کھڑے کھڑے ہم نے کچھ آیتیں کچھ درود وغیرہ پڑھ لیں، پھر بابا کی آنکھیں بچا کر پیچھے کے راستے سے پہاڑ کی طرف ہو لئے۔

اس پہاڑ کے پیچھے کیا ہے یہ دیکھنے کی ہمیں بڑی آرزو تھی۔ اب ہم پہاڑ کے پیچھے والے علاقے کی طرف مڑ گئے۔ یہاں ہمیں ایک چھوٹا سا کنواں دکھائی دیا جس پر کچھ خوبصورت بلیاں بیٹھی نظر آئیں۔

اور ان بلیوں کے جسم سے ایک مست کرنے والی خوشبو فضا کو معطر کر رہی تھی۔

ہمیں دیکھ کر یہ بلیاں کنوئیں کے اندر کود گئیں۔

ادھر آسمان پر بھورے کالے ابر کے ٹکڑے تیرتے ہوئے اس علاقے کی طرف بڑھنے لگے ...... اور شام ہونے لگی۔ سامنے ڈھلوان سے کئی بلیاں نیچے کی طرف بھاگتی نظر آنے لگیں اور وادی کے دو ٹیلوں کے بیچ والے میدان میں جھونپڑیاں صاف دکھائی دینے لگیں۔ آسمان ابر آلود، ٹیلوں پر اندھیرا، بھاگتی ہوئی بلیاں، اور پھر فضا میں مہکتی ہوئی خاموشی .... ہمیں ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم کسی سنسنی خیز خواب کے دہانے پر کھڑے بیداری اور نیند کے درمیان ہچکولے کھا رہے ہیں۔ شاید ہم کسی ناقابل بیان قوت کے زیر اثر یونہی آگے نکل جاتے اگر ہمیں ''پہلے بابا'' کی آواز نہ سنائی دیتی۔

وہ ہمارے پیچھے دوڑے آ رہے تھے اور چلا رہے تھے ''بچو واپس آجاؤ''۔ واپس، وہاں خطرہ ہے۔ واپس لوٹو۔ واپس '' اور بعد ہمیں پہلے بابا نے بہت ڈانٹا اور ہاتھ پکڑ کر ہمیں وہ واپس لے آئے۔ '' کبھی اس کنوئیں کے آگے قدم نہ رکھنا سمجھے، ورنہ بلی گاؤں والے تمہیں پکڑ کر تمہیں بھی بلی بنا دیں گے .... ''

مگر .... دو تین دنوں بعد نہ جانے ہمیں کیا ہوا۔ پہلے بابا سے چھپ چھپا کر ہم کنوئیں تک پہنچ ہی گئے۔

چونکہ دوپہر تھی اور شام ہونے میں کافی دیر تھی اور ہمیں کوئی خاص ڈر بھی نہیں لگ رہا تھا۔ اس لئے ہم آگے بڑھ گئے۔

کنوئیں کے اس پار، وادی اور ٹیلوں پہ کوئی ذی نفس نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرا دوست آگے چل نہ سکا۔ وہ کنوئیں کے قریب والے ایک چٹان کے سایہ میں بیٹھ گیا۔ میں نے پانی کی بوتل سے پانی پیا اور وادی کے اس مقام پر پہنچنے کی کوشش کی

جہاں کچھ دن پہلے ہم نے جھونپڑیاں دیکھی تھیں مگر اس وقت کوئی جھونپڑی، کوئی بلی، نظر نہیں آ رہی تھی۔ صرف ایک خوشبو بھری خاموشی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ میرا دل دھڑکنے لگا اور میرے پاؤں جیسے زمیں میں اندر دھنسنے لگے ہوں۔

بڑی ہی مشکل سے واپس کنوئیں تک میں لوٹ آیا۔ اور میں نے قسم کھائی کہ کبھی اس جگہ جانے کا خیال دل میں نہیں لاؤں گا۔ تین چار دن یوں ہی گذر گئے ...... پھر ایک رات میں جب سونے کی کوشش میں بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرے اطراف خوشبوئیں پھیلنے لگی ہوں۔ مہکتی خاموشی نے میرے سوچنے کی قوت کو جیسے شل کر دیا ہو۔ اور کوئی انجان طاقت مجھے باہر دھکیل رہی ہو، اور پھر میں کسی زر خرید غلام کی طرح چپ چاپ باہر نکل پڑا .... اور جوں ہی پہاڑ کے سرے پر پہنچا تو ایک پر اسرار لیس دار روشن ربر کی طرح دیوار کو اس گاؤں کے اطراف گھیرے ہوئے پایا اور اسی کو چیر کر میں وادی میں پہنچ گیا۔

ہوائیں دھیمی اور ٹھنڈی چل رہی تھیں، وادی میں اب جھونپڑیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ ان جھونپڑیوں کے دروازوں پر قندیلیں لٹک رہی تھیں۔ تقریباً سو جھونپڑیاں ہونگیں اس جگہ زمین صاف ستھری، راستے پاک صاف نظر آ رہے تھے۔

ٹھنڈک اور خوشبوؤں کے درمیان میں نے اس بلی گاؤں میں قدم رکھا۔ چاندنی ابر کے ٹکڑوں سے چھپا چھپی کر رہی تھی اور اس کا سحر انگیز اثر اس خوشنما وادی کو بہت ہی دل فریب بنا رہا تھا اور اُدھر دراز قد، خوبصورت، نیم برہنہ لڑکے لڑکیاں، قطار در قطار آ کر مجھے خوش آمدید کہنے لگیں۔ سب کی زبان نہایت شیریں اور

سب کے جسم سے خوشبو کے گویا فوارے نکل رہے تھے۔

مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ یہ عجیب قسم کے لوگ کہاں سے آئے ہیں۔ یہ شاید ایرانی النسل ہونگے یا تو بلوچ یا کوہ قاف کے نواحی علاقوں سے آئے ہوئے باشندے ہونگے۔ یہ لوگ بڑی صاف اردو بول رہے تھے۔

''ہر نیک اور صاف دل انسان کی بولی ہر صاف دل انسان سن اور بول سکتا ہے۔ تم ایک صاف دل لڑکے ہو۔ اور یہ بھی گاؤں صاف اور نیک دل انسانوں کا ایک گاؤں ہے.....اے نیک دل شہزادے آؤ میرے ساتھ۔'' یہ کہہ کر ایک نہایت خوبصورت عورت مجھے ایک چھوٹے سے آبشار کے پیچھے چھپے ہوئے غار کی طرف لے گئی۔ یہ آبشار کئی تہوں میں بنا ہوا تھا اور ایک پتھر سے نکلتے ہوئے اس بستی میں گر رہا تھا اور یہاں سے اس کی ایک نہر آگے بڑھ کر تالاب کی شکل اختیار کر چکی تھی جہاں سے گاؤں والے پانی لیتے تھے۔

غار کے اندر کافی جگہ تھی......ایک سنگھاسن جیسے تخت نما پتھر ایک سرے پر رکھا ہوا تھا اور اسکے سامنے کافی جگہ لوگوں کو کھڑے رہنے یا بیٹھنے کی موجود تھی۔ دونوں بازو پتھریلی دیواریں تھیں جس پر کئی رنگین خوشبودار بیلیں دیکھی جا سکتی تھیں۔

وہ خوبصورت عورت مجھے کھینچ کر پتھریلی دیوار کے اس حصہ میں لے گئی جو اس تخت کے پیچھے تھا۔ اس جگہ ایک مرمر سے زیادہ سفید اور نرم پتھر لگا ہوا تھا۔ عورت نے اس پتھر کے سامنے مجھے کھڑا کر دیا جب کہ اس پتھر میں میری پوری شبیہ صاف نظر آنے لگی اور میں نے دیکھا کہ میرے دل سے ایک شفاف و ملائم پر اسرار روشنی نکل کر سارے ماحول کو منور کرنے لگی ہے۔

اس عورت کی زبان سے نکلا ''مرحبا، مرحبا، یہ آئینہ کہہ رہا ہے کہ تم

بہت اچھے لڑکے ہو۔ اچھے انسانوں سے ہم بہت خوش ہوتے ہیں، چلو تمہیں کچھ اور چیزیں دکھاؤں''۔ اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھنے لگی۔ اس کے ہاتھ بہت ہی نرم تھے، ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی انگلیوں کی جگہ ریشم کی تاریں لگیں ہوں۔ اس کی چال ایسی لگی کہ جیسے بہار رقص کرنے لگی ہو۔ وہ مجھے ایک بڑے پتھر کی طرف لے گئی جہاں سامنے ایک سپاٹ سی جگہ تھی جس میں سو دو سو لوگ بیٹھ سکتے تھے۔

''یہ ہے ہمارے سردار کا تخت۔''

اماوس کی رات کو اسی جگہ سردار آ کر بیٹھتے ہیں اور ان کے سامنے اس گاؤں کی عورتیں گاتی اور ناچتی ہیں۔

''یہاں کے مرد بڑے خوب رو ہوتے ہیں جیسے کہ تم دیکھ ہی رہے ہو۔ یہاں مردوں اور عورتوں کی آبادی بھی برابر برابر ہے۔ گویا مرد سو ہیں تو عورتیں بھی سو۔ یہاں کوئی چیز کسی کی ملکیت نہیں ہوتی سب چیزیں سب کے لئے ہوتی ہیں کھانا، پانی، لباس، جو ہم خود بناتے ہیں.... یہاں تیرا میرا کا جھگڑا نہیں ہوتا........''

مگر ہماری آبادی اب بہت ہی کم ہوتی چلی جارہی ہے۔ ایک عورت کے بمشکل ایک ہی بچہ ہوتا ہے۔ کئی عورتیں بچے کی خواہش کرتے کرتے اس دنیا سے چلی جاتی ہیں۔ یہاں بڑی عمر کی عورتیں اکی دکی ہونگی کیونکہ یہاں لوگ کئی سال تک جوان ہی رہتے ہیں۔ یہاں کی عمریں کئی سال تک ۲۲ یا ۳۲ پہ جیسے ٹھہر جاتی ہیں اور شاید پورے سو سال بعد ہی عمریں ڈھلتی نظر آتی ہیں اور وہ بھی بڑی تیزی سے۔ مگر افسوس اتنی جوان اتنی حسین ہونے کے باوجود یہ عورتیں بچہ پیدا نہیں کر سکتیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے دل سے جیسے کوئی آہ نکلی ہو وہ عورت بہت اُداس ہو گئی، غم کے بادل اس کے چہرے پر اُبھر آئے اور اسکی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

''یہاں کے لوگ مشک بلیوں کو شوق سے پالتے ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ بلیوں کو پالنے کی وجہ بچے پیدا کرنے کی قوت کم ہو جاتی ہے۔

آج میری عمر تم لوگوں کے حساب سے ۵۰ کی ہوگی۔ مگر کوئی بچہ نہیں ہوا۔ حالانکہ میں اب بھی ۲۰ سال کی ہی لگتی ہوں، ہے نا۔''

پھر وہ مجھے آگے لے گئی۔ ''یہ دیکھو یہ ہماری عبادت گاہ ہے۔ یہاں کوئی مورت نہیں، یہاں کوئی صورت نہیں، یہاں کوئی اک سمت کی طرف نہیں مڑتا۔ سب اپنے اپنے طور پر ہاتھ اٹھا اٹھا کر پروردگار سے مانگتے ہیں۔ تمہاری طرح کوئی اللہ کا پجاری، رام کا پجاری، یا یسوع مسیح کا پجاری نہیں ہوتا، بلکہ سب اپنے آگے اپنے گود کے بچوں کو اس مقدس جگہ پر بٹھا کر دعائیں مانگتے ہیں اور فریاد کرتے ہیں گویا یہ اپنے ہی چھوٹے بچوں کو عبادت کے قابل سمجھتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ بہت ہی چھوٹا بچہ ساری کائنات کو دیکھ سکتا ہے ساری کائنات سے بات چیت کر سکتا ہے، وہ ہواؤں کو چلا سکتا ہے، بارش برسا سکتا ہے۔ طوفان لا سکتا ہے۔ غرض کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے جو انسان نہیں کر سکتا۔ مگر جوں جوں وہ بڑھنے لگتا ہے ویسے ہی وہ اپنی اصلی قوتیں کھونے لگتا ہے۔ وہ بھگوان سے انسان بننے لگتا ہے اور چلتے چلتے انسان سے شیطان۔ اے نیک لڑکے ہم بخوبی جانتے ہیں کہ جب اس قوم میں کوئی چھوٹا معصوم نہیں رہیگا اس وقت یہاں پر عذاب نازل ہوگا۔ یہاں زلزلہ آئیگا اور بستی تباہ ہو جائیگی۔'' یہ کہتے کہتے وہ پھر اُداس ہو گئی اور اس کے اُداس ہونے سے گویا سارا ماحول اُداس ہو گیا تھا۔ کچھ دیر اس عجیب خوشبودار خوبصورت دنیا کی سیر کرنے کے بعد وہ عورت مجھے کنوئیں کے قریب لے آئی۔

''دیکھو اب صبح ہو رہی ہے۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

واقعی پہاڑ کے اس پار صبح کی خوشنما لالی پہاڑوں میدانوں میں پھیل گئی تھی اور پرندے ادھر اُدھر اپنی بولیوں کو بکھیرنے لگے تھے۔ وہ لڑکی کنوئیں کے کنارے تک مجھے لے آئی اور مجھے باہر ڈھکیل دیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے پھر سے میں کوئی چار پانچ انچ والی شفاف ربر جیسی مقناطیسی چادر کو چاک کر کے باہر آیا ہوں۔

گھر کے لوگ سب پریشان تھے کہ میں کہیں کھو گیا۔ لیکن مجھے دوسرے ہی صبح گھر آتے دیکھ کر سبھوں نے اطمنان کی سانس لی۔

اس کے بعد ہم مدراس واپس آگئے اور اور ...... میں بڑا ہوتا گیا میں نے خوب پڑھائی کی ۲۳، ۲۴ برس میں گریجیوشن کر لی اور دن رات ایک کر کے میں نے I.A.S کر لیا۔ یہ ۱۹۵۵ء کی بات تھی جب میری پوسٹنگ احمد آباد میں ہوئی۔ یہاں اسسٹنٹ کلکٹر کی حیثیت سے میں نے پانچ سال گزارے اور بلی گاؤں والا واقعہ میرے ذہن سے بالکل ہی نکل گیا۔ یہیں میری شادی جوناگڑھ کے ایک رئیس کی گود لی ہوئی حسین و جمیل لڑکی ریشما سے ہوگئی۔ اس دوران ہمارے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کا نام ہم نے شگفتہ رکھا۔ یہ نہایت ہی خوبصورت بڑی پیاری بچی تھی جو اپنی ماں پر گئی تھی اور تعجب یہ کہ اس کے جسم سے مشک بلی کی خوشبو نکلتی تھی۔ میں اور میری بیوی ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے۔ وہ مجھ پر فدا تھی اور میں اس پر۔

تھوڑے دنوں بعد میری تبدیلی ویلور ہوئی۔ یہاں میں کلکٹر بن کر آیا تھا۔ یہاں آتے ہی میں نے اڈمنسٹریشن کو ڈی سنٹرلیز کرنا شروع کر دیا۔ اس ضمن میں، میں نے RDO کی میٹنگ بلائی۔ میٹنگ کے دوران پرنامبٹ کے کچھ عجیب و غریب حالات کا ذکر وہاں کے لوگوں نے کیا۔ ان کے مطابق ایک پہاڑ سے اکثر بلیاں آتی تھیں، گاؤں میں گھس کر لوگوں کو پریشان کرتی تھی۔ اناج اور چیزوں کو

اٹھالے جاتی تھی اور یہاں تک کہ گاؤں کے چھوٹے بچے بھی غائب ہو جاتے تھے۔ کبھی راتوں میں اس پہاڑ کے پیچھے سے عورتوں کے رونے کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔

ہمیں GSI والوں نے یہ درخواست دی تھی کہ اس علاقے میں پٹرول کی کھوج ہوگی۔ اور ان کی ٹیم سے ہمارا عملہ تعاون کرے گا۔

میں ایک بار پھر پر نام بٹ پہنچا۔ اس وقت چونکہ مجھے زیادہ دن ٹھہرنا تھا اس لئے ریشما اور میری بیٹی شگفتہ بھی میرے ساتھ تھی۔ میرا ایک نوکر بھولو یہاں کے حالات خوب جانتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا ''پہاڑ کے اس پار ایک بڑا عجیب علاقہ ہے کوئی وہاں آتا جاتا نہیں ہے۔ وہاں سے رات گئے ہواؤں کے ساتھ ہلکی ہلکی خوشبوئیں آتی محسوس ہوتی ہیں اور رات میں انسانوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کبھی کبھار عورتوں کی رونے کی آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ لوگ انہیں ماورائی مخلوق سمجھتے ہیں۔ کئی لوگ اس علاقہ کو جنوں کا اڈہ سمجھتے ہیں۔ "اگر کوئی بھولا بسرا اُدھر نکل جائے تو وہ یا تو واپس نہیں آتا یا جب واپس آتا ہے تو اپنی یادداشت کھو بیٹھتا ہے''۔

پر ہمیں ان پہاڑوں سے آگے نکلتی ایک سڑک ضرور بنانی تھی کیونکہ GSI والے یہی چاہتے تھے۔

اسلئے ہم ایک کوارٹرس میں رہنے لگے۔ اس کوارٹرس سے میدان میں بنی درگاہ اور درگاہ کے پیچھے والے پہاڑ صاف نظر آتے تھے۔ پہلی ہی رات عورتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور آوازوں کو سن کر میری بیوی ریشما بڑی پریشان ہونے لگی۔ درگاہ کے مجاور پیلے بابا اب اس دنیا میں نہیں رہے کہ ان سے کچھ پوچھا جائے۔

چاند کی بارھویں یا تیرھویں رات ہی ہوگی جب بچی شگفتہ کو گود میں لئے ہوئے میری بیوی باہر ٹہل رہی تھی، دھیمی دھیمی خوشبودار ہواؤں کے ساتھ عورتوں کے رونے کی آوازیں پھر سنائی دینی شروع ہوئیں۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا یہ آوازیں بہت قریب آنے لگیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ آوازیں مجھے اور میری بیوی کو صاف سنائی دے رہی تھیں مگر میرے نوکر بھولو اور نوکرانی کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا کیونکہ وہ مست سو رہے تھے۔

کچھ ہی دیر میں خوشبوؤں کا ایک دریا ہمیں لپیٹنے لگا۔ پھر ہم کسی انجانی قوت کے ہاتھوں مجبور ہو کر M1 اور M2 دو پہاڑوں کی جانب پیدل ہی نکل پڑے۔ اُسی وقت بلی پکڑنے والوں کا ایک گروپ بھی پہاڑوں کی جانب بڑھنے لگا۔ ہم اب کنوئیں تک پہنچ چکے تھے جہاں سے آگے وہ عجیب علاقہ تھا۔ رونے کی آوازیں برابر آرہی تھیں۔ جوں ہی ہم کنوئیں کے پاس پہنچے ہمیں محسوس ہوا کہ کسی نے ہمیں دھکہ دے کر ایک انجانی شفاف چادر سے اندر دھکیل دیا ہے اور پھر مجھے لگا کہ میں نیند سے جاگ اٹھا ہوں۔ اب بلی گاؤں کی ایک ایک بات مجھے یاد آنے لگی۔ ہمیں دیکھ کر وہاں کے لوگوں نے ہمیں اپنے ساتھ لیا اور عبادت گاہ تک لے جانے لگے۔ راستے میں وہ پتھر جو آئینے کا کام کرتا ہے ہم نے دیکھا اب اس پتھر میں میری تصویر اُتنی صاف نظر نہیں آرہی تھی۔ اس زمین پہ اب زلزلے کے جھٹکے بھی شروع ہو چکے تھے اور پہاڑوں کے درمیان زمین شق ہونے لگی تھی .... عورتیں زور زور سے چیخنے لگی تھیں۔ باہر کے لوگ یہ آواز سن نہیں سکتے تھے۔ مگر پہاڑوں کی گڑگڑاہٹ انہیں شاید سنائی دینے لگی اس لئے لوگ گھبرا کر دور ہی سے یہ نظارہ دیکھنے لگے۔

جب چٹان زور زور سے گرنے لگے اور بلی گاؤں کے لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے تو نہ جانے کیوں ریشما اپنی بچی کو لے کر عبادت گاہ میں گھس گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے معصوم بچی کو سامنے پوجا گھر کے بڑے پتھر پر لٹا دیا اور خود ہی اس کے آگے پوجا کرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ یہ دیکھ کر وہاں کی روتی ہوئی عورتیں اور مرد عبادت گاہ میں واپس چلے آئے اور چھوٹی بچی کے آگے ہاتھ جوڑ کر پوجا کرنے کے انداز میں بیٹھ گئے اور اس طرح انہوں نے اپنی دُعائیں شروع کر دیں...... انہیں یقین تھا کہ زلزلہ ختم جائے گا اور وہ سب بچ جائیں گے کیونکہ ایک معصوم بچی ان کے درمیان آگئی ہے تھوڑی دیر کے لئے ایسا ہی ہوا۔

مجھے بے حد حیرانی تھی کہ میری بیوی نے ایسا کیوں کیا۔ کچھ دیر بعد ریشما خود میرے پاس آئی اور کہنے لگی ''دیکھئے یہ گاؤں تب تک سلامت ہے جب تک یہاں کوئی گود کا بچہ یا بچی اس قوم میں موجود ہے ورنہ یہاں سب کچھ برباد ہو جائے گا اور اس قوم کا خاتمہ ہو جائے گا...... لہٰذا اس قوم کو آپ بچا سکتے ہیں تو بچا لیجئے۔ اس قوم کو آپ کی بچی دے دیجئے کیونکہ آپ کی بچی اس گاؤں کو بچا سکتی ہے۔ کیا آپ ایک اچھی نیک خوبصورت قوم کو بچانے کے لئے اپنی ننھی سی بچی کا دان نہیں دیں گے؟ ایک بچی کے بدلے میں ایک قوم زندہ بچے گی۔ کیا آپ ایسا نہیں کر سکتے۔''

''نہیں، یہ گاؤں رہے یا نہ رہے یہ قوم بچے یا نہ بچے اس سے تمہارا کیا لینا دینا۔''

''ہاں'' وہ ایک پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولی ''میرا بہت کچھ اس گاؤں سے واسطہ ہے، اس قوم سے واسطہ ہے، کیونکہ میں بھی اسی قوم کی ہوں۔!''

زلزلہ اب ختم چکا تھا، بچی پتھر پر پڑی کھیل رہی تھی، اور ریشما میرے

آگے لرزتی لڑکھڑا رہی تھی۔ مجھے تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا، ریشما اور اس قوم سے اس کا تعلق؟

ماضی کے کئی سال میری نگاہوں میں ناچ ناچ کر مجھے چڑھا رہے تھے اور مجھ سے کہنے لگے تھے کہ ریشما کی وفائیں، اس کی ادائیں، اس کی اچھائیاں ایک فریب تھا، ایک دھوکہ تھا، وہ جس سے میں اتنی محبت کرتا رہا، جس پر مرتا رہا، وہ میری کبھی تھی ہی نہیں!

مجھے اپنے آپ پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ میں نے اسے بھی بہت بُرا بھلا کہا، ہاتھ پیر پٹخے اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے...... مجھے روتا دیکھ کر وہ بھی بہت روئی اور بہت گڑگڑائی۔ مگر نہ جانے اسے کیا سوجھی وہ میرا ہاتھ تھام کر آگے کنوئیں کی طرف بڑھ گئی اور میرے ہاتھ میں اپنی بچی کو تھما کر اس گاؤں سے باہر مجھے دھکیل دیا۔

تب پھر زلزلہ شروع ہو گیا، پہاڑ ٹوٹنے لگے اور اس علاقے سے رونے چیخنے کی آوازیں پھر سے شروع ہو گئی۔

''میرے سرکار مجھے معاف کرنا۔ میری تقدیر، میرا مقدر، میری قوم مجھے پکار رہی ہے۔ آپ بچی کو جلدی سے اس پہاڑ سے دور، اس گاؤں سے دُور لے جایئے...... خدا حافظ میرے سرکار خدا حافظ۔''

یہ کہہ کر وہ بلی گاؤں میں تڑختے پہاڑوں، چٹانوں کے درمیان گم ہو گئی اور پھر سارا بلی گاؤں زلزلہ کی زد میں آ گیا۔

گاؤں کے کچھ لوگ اور سرکاری ملازمین بلی گاؤں کے باشندوں کو بچانے لگے۔

شاید کچھ لوگ بچ گئے ہونگے...... مگر ریشما کا آخر تک پتہ نہ چلا!

AUR SAYE BOLNE LAGE

(...And the shadows began to speak)

A Collection of Urdu Short Stories

by

ANWAR RABBANI

انور ربانی اور اچھی کہانی دو لازم و ملزوم حقیقتیں ہیں۔ آپ نے تمل ناڈو کی سرزمین میں اردو افسانے کی نہ صرف آبیاری کی بلکہ اسے ایک تناور درخت بنا کر چھوڑا۔

انور ربانی ایک نہایت ہی ہمدرد انسان اور حساس فن کار ہیں۔ آپ کا اسلوب صاف ستھرا اور حقیقت مندانہ ہوا کرتا ہے۔ صحرائے لاشعور میں بھٹکنے سے آپ ہمیشہ دامن بچاتے ہیں۔ آپ کا ہر افسانہ آپ کے تخلیقی کرب کا غماز ہے اور آپ کی فنی دسترس ہر باشعور قاری کو بہ آسانی اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ آپ کے افسانوں کی امتیازی خصوصیت پلاٹ کی دلکشی اور زبان کی سادگی ہے۔ آپ کا فنی کینوس زیادہ وسیع نہ سہی مگر متنوع ضرور ہے۔ ہر افسانہ دوسرے افسانے سے الگ نوعیت کا ہوتا ہے۔

انور ربانی کے بعض افسانوں میں دکھائی دینے والے فوق الفطری عناصر میں نفسیاتی اور سماجی عوامل کچھ اس طرح کارفرما ہیں کہ اگر فنی ایمانداری سے ان کا تجزیہ کیا جائے تو یہ فوق الفطری یا آسیبی عناصر خود بخود انجانی حقیقتوں میں تحلیل ہوتے نظر آئیں گے۔

...اور سائے بولنے لگے اردو افسانوی ادب میں نہ صرف گراں قدر اضافہ ثابت ہوگا بلکہ جنوب کی نمائندگی کے خلا کو بھی پُر کردے گا۔



سجاد بخاری

Sarmadi Publications
Flat No.4, Ist Floor, Old No.158, Lloyds Road
Chennai - 86.